فہرست

شذرات	قربانی	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۳۳۔ ۲۳۵)	جاوید احمد غامدی	۵
معارفِ نبوی	فرض عبادات	زاویۂ فراہی	۹
	اہل قدر سے قطع تعلق۔ چھ ملعون	طالب محسن	۱۶
حالات و وقائع	عروج و زوال کا قانون (۱)	ریحان احمد یوسفی	۲۱
وفیات	ابو شعیب صفدر علی کی یاد میں	محمد بلال	۳۳
یسئلون	متفرق سوالات	شہزاد سلیم/ صدیق شاہ بخاری	۴۱
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	کوکب شہزاد۔ محمد اسلم نجمی ریحان احمد یوسفی۔ وسیم اختر مفتی	۴۷
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قربانی

متاع عزیز کو راہ خدا میں پیش کر دینا قربانی ہے۔ مال و دولت، عزیز و اقارب اور مسکن و وطن انسان کے لیے متاع بے بہا کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا ہدیہ بھی وہ پادشاہ ارض و سما کی نذر کرتا ہے، مگر دنیا میں اس کی سب سے بڑی متاع اس کی جان ہے۔ بندگی رب کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس اثاثۂ گراں مایہ کو حقیر نذرانہ سمجھ کر اپنے پروردگار کے حضور میں پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے۔ یہ تڑپ اگر ہے تو ایمان ہے، اگر نہیں ہے تو گویا انسان ایمان سے محروم ہے۔ چوپائے کی گردن پر چھری پھیر کر ایک مسلمان اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اگر میرے پروردگار نے جان کا مطالبہ کیا تو میں اسی طرح بصد شوق اپنا سرتن سے جدا کر کے اس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رویاے صادقہ پر بعینہٖ عمل کو منشاے خداوندی سمجھتے ہوئے اپنے عزیز از جان فرزند کی گردن پر چھری رکھ کر اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنی گردن اللہ کے لیے پیش کر کے قربانی کے تصور کو بالکل مجسم اور ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ عیدالاضحی کے روز ہر مسلمان اس عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے اور اس کے تناظر میں گویا اپنے پروردگار سے یہ اقرار کرتا ہے کہ: ''میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے۔''

اس قربانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی تاکہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں، ان پر وہ اس کا نام لیں۔ پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو۔ اور خوش خبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔ ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے، اس پر صبر کرنے والے، نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے، اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔''
> (الحج ۲۲: ۳۴۔۳۵)

ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قربانی من جملۂ عبادات ہے۔ انبیا کی امتوں میں یہ ہمیشہ مشروع رہی ہے۔ یہ خالص اللہ کے لیے ہے۔ اسے شرک کے شائبے سے بھی پاک ہونا چاہیے اور اسے اپنے آپ کو اپنے مالک کے حوالے کر دینے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کے جذبے سے انجام دینا چاہیے۔ جو لوگ اپنے گلے میں اللہ کی غلامی کا کلادہ ڈال لیتے ہیں، روح اور قالب، دونوں اپنے پروردگار کے سپرد کر دیتے ہیں، وہی مخبتین ہیں، وہی مومن ہیں اور انھی کے لیے اس جنت کی بشارت ہے جو خدا نے اپنے غلاموں کے لیے آباد کی ہے۔ ان لوگوں کا عام سلوک یہی ہے کہ یہ رنج وراحت میں اپنے مالک کی یاد تازہ رکھتے ہیں، اس کے آگے سربسجود ہوتے ہیں اور اس کا دیا ہوا مال اسباب اس کی راہ میں نثار کرتے ہیں۔

قربانی کی یہی روح ہے جو انسان کے اندر تقوے کو پروان چڑھاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ نہیں ہے کہ محض جانور قربان کر کے گوشت اس کی نذر کر دیا جائے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس عمل سے تقویٰ بیدار کیا جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

''اللہ کو تمھاری ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچے گا نہ خون، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچے گا۔'' (الحج ۲۲: ۳۷)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ قربانی جو تمھیں پیش کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے، وہ اس لیے نہیں ہے کہ خدا کو ان قربانیوں سے کوئی نفع پہنچتا ہے۔ خدا کو ان قربانیوں کا گوشت یا خون کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ تمھاری پیش کی ہوئی یہ چیز تمھی کو لوٹا دی جاتی ہے۔ تم خود اس کو کھاؤ اور بھوکوں اور محتاجوں کو کھلاؤ۔ قربانی کی مثال بالکل یوں ہے کہ کوئی اپنے سر کے تاج کو اصل بادشاہ کے قدموں پر رکھے اور بادشاہ اس تاج کو اپنے قدموں سے عزت دے کر پھر اس کے سر پر پہنا دے۔..... خدا قربانیوں کے خون سے محظوظ نہیں ہوتا، بلکہ اس تقویٰ اور اس اسلام و اخبات سے خوشنود ہوتا ہے جو ان قربانیوں سے ان کے پیش کرنے والوں کے اندر پیدا ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۲۴۴، ۲۵۱)

چنانچہ قربانی کا اصل مقصد نہ احباب کو خوان نعمت میں شریک کرنا ہے، نہ تہوار کی تقریب کو دوبالا کرنا ہے اور نہ غریبوں کی مدد کرنا ہے، یہ فوائد ضمنی طور پر بلا شبہ اس سے حاصل ہو جاتے ہیں، مگر اس کا اصل مقصد تقویٰ کی نشوونما ہے۔ یہ مقصد اگر پیش نظر نہ رہے تو ہم بظاہر جانور ذبح کر کے فارغ ہو جاتے ہیں، مگر قربانی کی اصل روح سے غافل رہتے ہیں اور اس طرح اس عبادت سے ہمارے اندر تقوے کی آب یاری نہیں ہوتی۔

—— منظور الحسن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۴۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ، وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ، لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ، لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ، وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ . فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ، وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. ﴿۲۳۳﴾

اور (طلاق کے بعد بھی) مائیں اُن لوگوں کے لیے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہتے ہوں، اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں گی اور بچے کے باپ کو (اِس صورت میں) دستور کے مطابق اُن کا کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اُس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اُس کے بچے کے سبب سے ـــــ اور اِسی طرح کی ذمہ داری اُس کے وارث پر بھی ہے ـــــ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور آپس کے مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اِس میں بھی کوئی مضایقہ نہیں، بشرطیکہ (بچے کی ماں سے) جو کچھ دینا طے کیا ہے، وہ دستور کے مطابق اُسے دے دو۔ اور اللہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَالَّـذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ

سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[۶۱۵] ۲۳۳

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں[۶۱۶]۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ

---

[۶۱۵] طلاق کے بعد بچے کی رضاعت کے جو احکام اس آیت میں بیان ہوئے ہیں، ان کا خلاصہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہے:

''۱۔ مطلقہ پر اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلانے کی ذمہ داری ہے، اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت یہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔

۲۔ اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ہے اور اس معاملے میں دستور کا لحاظ ہو گا، یعنی شوہر کی حیثیت، عورت کی ضروریات اور مقام کے حالات پیش نظر رکھ کر فریقین فیصلہ کریں گے کہ عورت کو نان ونفقہ کے طور پر کیا دیا جائے۔

۳۔ فریقین میں سے کسی پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، نہ بچے کے بہانے سے ماں کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی، اور نہ بچے کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا دباؤ ڈالا جائے گا۔

۴۔ اگر بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اس کے وارث کی ہو گی۔

۵۔ اگر باہمی رضامندی اور مشورے سے دو سال کی مدت کے اندر ہی اندر بچے کا دودھ چھڑا دینے کا عورت مرد فیصلہ کر لیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

۶۔ اگر باپ یا بچے کے ورثا بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں، بشرطیکہ بچے کی والدہ سے دینے دلانے کی جو قرارداد ہوئی ہے، وہ پوری کر دی جائے۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۴۵)

[۶۱۶] بیوہ کی عدت میں عام مطلقہ کی نسبت سے یہ اضافہ اس لیے ہوا ہے کہ اس کو تو ایسے طہر میں طلاق دینے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں شوہر سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہو، لیکن بیوہ کے لیے اس طرح کا ضابطہ بنانا چونکہ ممکن نہیں ہے، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ دن بڑھا دیے جاتے۔ قرآن نے یہی کیا ہے اور مطلقہ کی نسبت سے اس کی مدت ایک ماہ دس دن زیادہ مقرر کر دی ہے۔

مطلقہ اور بیوہ کے لیے عدت کا حکم چونکہ ایک ہی مقصد سے دیا گیا ہے، اس لیے جو مستثنیات طلاق کے حکم میں بیان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَّ عَشۡرًا، فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِيۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ. وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِهٖ مِنۡ خِطۡبَةِ النِّسَآءِ اَوۡ اَكۡنَنۡتُمۡ فِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ، عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُوۡنَهُنَّ، وَلٰكِنۡ لَّا تُوَاعِدُوۡهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا، وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ، وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ

کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے[۶۱۷]۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اور اِس میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم اشارے کنایے میں نکاح کا پیغام اُن عورتوں کو دو یا اُسے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اُن سے یہ بات تو کرو گے ہی۔ (سو کرو)، لیکن (اِس میں) کوئی وعدہ اُن سے چھپ کر نہ کرنا۔ ہاں، دستور کے مطابق کوئی بات، البتہ کہہ سکتے ہو۔ اور عقد نکاح کا فیصلہ اُس وقت تک نہ کرو، جب تک قانون اپنی مدت پوری نہ کر لے۔ اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں

ہوئے ہیں، وہ بیوہ کی عدت میں بھی اسی طرح ملحوظ ہوں گے۔ چنانچہ بیوہ غیر مدخولہ کے لیے کوئی عدت نہیں ہو گی اور حاملہ کی عدت وضع حمل کے بعد ختم ہو جائے گی۔ بخاری کی روایت (رقم ۵۳۲۰) ہے کہ ایک حاملہ عورت، سبیعہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے یہی فیصلہ فرمایا۔

[۶۱۷] یعنی عدت گزر جائے تو اس کے بعد وہ آزاد ہے اور اپنے معاملے میں جو قدم مناسب سمجھے اٹھا سکتی ہے۔ معاشرے کے دستور کی پابندی، البتہ اسے کرنی چاہیے۔ یعنی ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے متعلق خاندانوں کی عزت، شہرت، وجاہت اور اچھی روایات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ ملحوظ رہے تو اس پر یا اس کے اولیا پر پھر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسوم کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو مورد طعن و الزام نہیں بنانا چاہیے۔ نہ شوہر کے وارثوں اور عورت کے اولیا کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا چکی کہ وہ اس سے تنگ آ گئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خدا نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں، بس انھی کی پابندی کرنی چاہیے اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۱/۵۴۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فَاحۡذَرُوۡهُ، وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ . ﴿۲۳۴۔۲۳۵﴾

میں ہے، اِس لیے اُس سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے[۶۱۸]۔ ۲۳۴۔۲۳۵

[۶۱۸] یعنی اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کرنا چاہتا ہو تو عدت کے دوران میں وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنے دل میں اس کا ارادہ کر لے یا اشارے کنایے میں کوئی بات زبان سے نکال دے، لیکن اس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ایک غم زدہ خاندان کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے یا کوئی خفیہ عہد و پیمان کرے۔ اس طرح کے موقعوں پر جو بات بھی کی جائے، اسے ہم دردی اور تعزیت کے اظہار تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ چنانچہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ تم اپنا یہ ارادہ ظاہر کرو گے، مگر اس طرح نہیں کہ نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کر دو، قول و قرار کر و یا چھپ کر کوئی عہد باندھ لو۔ اس کا انداز وہی ہونا چاہیے جو ایسے حالات میں پسندیدہ اور دستور کے موافق سمجھا جاتا ہے۔ عدت گزر جائے تو ان عورتوں سے نکاح کا فیصلہ، البتہ کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ زمانۂ عدت میں عورت کا رویہ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر عورتوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اگر اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں اس کے لیے عدت گزار رہی ہیں تو سوگ کی کیفیت میں گزاریں اور زیب و زینت کی کوئی چیز استعمال نہ کریں۔ ابوداؤد کی روایت (رقم ۱۹۶۰) ہے کہ آپ نے فرمایا: بیوہ عورت رنگین کپڑے نہیں پہنے گی، نہ زرد، نہ گیرو سے رنگے ہوئے۔ وہ زیورات استعمال نہیں کرے گی اور نہ مہندی اور سرمہ لگائے گی۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فرض عبادات

[اس روایت کی ترتیب و تدوین اور شرح و وضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں زاویۂ فراہی کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روی[1] انہ قال رجل من اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : نھینا ان نسال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن شئ فکان یعجبنا ان یجئ الرجل من اھل البادیۃ العاقل فیسالہ و نحن نسمع. فجاء[2] رجل الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اھل نجد[3] ثائر الرأس ، یسمع دوی صوتہ ، ولا یفقہ ما یقول حتی دنا فإذا ھو یسال عن الإسلام . فقال: یا رسول اللّٰہ ، اخبرنی ماذا فرض اللّٰہ علی من الصلاۃ[4]؟ فقال رسول اللّٰہ صلی علیہ وسلم : خمس صلوات فی الیوم واللیلۃ ۔ فقال : ھل علی غیرھا ؟ قال: لا الا ان تطوع.

فقال : اخبرنی ما فرض اللّٰہ علی من الصیام[5] ؟ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : صیام شھر رمضان[6] . فقال : ھل علی غیرھا ؟ قال : لا

الا ان تطوع .

فقال : اخبرنی بما فرض اللّٰه علی من الزکاۃ[7]. قال : و ذکر له رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم الزکاۃ[8]. قال : هل علی غیرها ؟ قال : لا الا ان تطوع.

قال : فادبر الرجل و هو یقول : واللّٰه لا ازید علی هذا و لا انقص[9] منه[10]. قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم : افلح ان صدق[11].

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک صاحب[1] کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ہمیں اس بات سے روک دیا گیا تھا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات پوچھیں[2]۔ چنانچہ ہم بہت خوش ہوتے جب ہمارے سامنے اہل بدو میں سے کوئی سمجھ دار آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر (دین کے بارے میں) سوال کرتا۔ ایک دن یہ ہوا کہ نجد کے لوگوں میں سے ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ اس کے بال پراگندہ تھے۔ آواز کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی، لیکن کیا کہتا ہے، یہ سمجھنا مشکل تھا۔ وہ کچھ قریب ہوا تو ہم نے سنا کہ اسلام کے بارے میں کچھ پوچھ رہا ہے۔ اس نے سوال کیا: یا رسول اللہ، مجھے بتائیے کہ اللہ نے میرے لیے کتنی نماز پڑھنا ضروری قرار دیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دن اور رات میں پانچ نمازیں۔ اس نے پوچھا: کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ زیادہ پڑھ لو۔

اس نے پوچھا: مجھے بتائیے کہ اللہ نے مجھ پر کتنے روزے فرض کیے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ماہ رمضان کے روزے۔ اس نے پوچھا: کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ زیادہ رکھ لو۔

اس نے پھر سوال کیا: اللہ نے مجھ پر کتنی زکوٰۃ فرض کی ہے؟ آپ نے اسے زکوٰۃ کی تفصیلات

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بتائیں۔اس نے پوچھا: کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ زیادہ دے دو[۳]۔

راوی کا بیان ہے کہ وہ لوٹا تو کہہ رہا تھا: میں اس پر نہ (اپنی طرف سے) کوئی اضافہ کروں گا اور نہ کوئی کمی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا: اگر یہ سچا ہے تو فلاح پا گیا۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ مسلم، رقم ۱۳ کے مطابق یہ صحابی انس بن مالک رضی اللہ عنہ تھے۔

۲۔ سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۱۰۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کو نزول قرآن کے دوران میں غیر ضروری سوالات سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس کا سبب یہ خدشہ تھا کہ وہ یہود کی طرح بے جا سوال کر کے اپنے اوپر ایسی پابندیاں نہ لگوا بیٹھیں جو ان کے لیے مشکلات کا باعث بنیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

> ''ایمان والو، ایسی باتوں سے متعلق سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں گراں گزریں اور اگر تم ان کی بابت ایسے زمانے میں سوال کرو گے جب قرآن اتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔'' (۵:۱۰۱)

صحابۂ کرام اس بنا پر بہت محتاط رہتے اور بعض اوقات ضروی سوالات پوچھنے سے بھی گریز کرتے تھے۔

۳۔ مسلم، رقم ۱۳ اور احمد بن حنبل، رقم ۲۱۴۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے حج کے بارے میں بھی سوال کیا تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۴۶ ہے۔ کچھ فرق کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے: بخاری، رقم ۱۷۹۲، ۲۵۳۲، ۶۵۵۶۔ مسلم، رقم ۱۱، ۱۲۔ ترمذی، رقم ۶۱۹۔ نسائی، رقم ۴۵۸، ۲۰۹۰، ۲۰۹۱، ۵۰۲۸۔ ابوداؤد، رقم ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۲۵۲۔ احمد ابن حنبل، رقم ۱۳۹۰، ۲۲۵۴، ۲۳۸۰، ۱۲۴۷۹، ۱۳۰۳۴، ۱۳۸۴۲۔ موطا، رقم ۴۲۳۔ دارمی، رقم ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۱۵۷۸۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۳۱۹، ۲۴۰۰، ۲۴۰۱، ۵۸۶۳، ۱۱۷۵۹۔ ابن خزیمہ، رقم ۳۰۶، ۲۰۷۴۔ بیہقی، رقم ۱۵۷۲، ۲۰۵۷، ۴۲۳۵، ۴۲۳۷، ۷۶۹۲، ۸۳۹۴۔ ابن حبان، رقم ۱۵۵، ۱۷۲۴، ۳۲۶۳۔ ابویعلیٰ، رقم ۳۳۳۳۔

۲۔ 'نهينا ان نسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن شئ فكان يعجبنا ان يجئ الرجل من اهل البادية العاقل فيساله و نحن نسمع ۔ فجاء' (ہمیں اس بات سے روک دیا گیا تھا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے کوئی بات پوچھیں۔ چنانچہ ہم بہت خوش ہوتے جب ہمارے سامنے اہل بدو میں سے کوئی سمجھ دار آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر (دین کے بارے میں) سوال کرتا۔ ایک دن یہ ہوا کہ نجد کے لوگوں میں سے ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔) کے الفاظ بخاری، رقم ۴۶ میں نقل نہیں ہوئے۔ یہ مسلم، رقم ۱۲ سے لیے گئے ہیں۔

بخاری، رقم ۴۶ میں 'فجاءَ' (چنانچہ ایک آدمی آیا) کی جگہ 'جاء' (ایک آدمی آیا) نقل ہوا ہے اور اسی سے روایت کا آغاز ہو رہا ہے۔ واقعے کے حوالے سے بھی مسلم، ترمذی اور احمد بن حنبل وغیرہ میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ احمد بن حنبل میں یہ واقعہ بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس روایت کا مکمل متن حسب ذیل ہے:

روی انه بعثت بنو سعد بن بكر ضمام بن ثعلبة وافدا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقدم عليه واناخ بعيره على باب المسجد، ثم عقله، ثم دخل المسجد ورسول الله صلى الله عليه وسلم جالس فى اصحابه، وكان ضمام رجلا جلدا اشعر ذا غديرتين، فاقبل حتى وقف على رسول الله صلى الله عليه وسلم فى اصحابه، فقال: ايكم بن عبد المطلب؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: انا بن عبد المطلب. قال: محمد؟ قال: نعم. فقال: بن عبد المطلب، انى سائلك و مغلظ فى المسالة، فلا تجدن فى نفسك. قال: لا اجد فى نفسى، فسل عما بدا لك. قال: انشدك الله الهك واله من كان قبلك واله من هو كائن بعدك، الله بعثك الينا رسولا؟! فقال: اللهم، نعم. قال: فانشدك الله الهك واله من كان

''روایت ہوا ہے کہ قبیلۂ سعد بن بکر نے ضمام بن ثعلبہ کو اپنے نمائندے کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ جب وہ پہنچا تو اس نے اپنا اونٹ مسجد کے دروازے پر بٹھایا اور اسے باندھ دیا۔ پھر وہ مسجد میں داخل ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ ضمام ایک طاقت ور آدمی معلوم ہو رہا تھا اور اس کے بال لمبے تھے۔ اس نے اپنے بالوں کو دو چوٹیوں کی صورت میں باندھا ہوا تھا۔ وہ ہمارے قریب ہوا، یہاں تک کہ وہاں پہنچ گیا جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ پھر اس نے پوچھا: تم میں سے عبدالمطلب کا بیٹا کون ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ پھر اس نے پوچھا: کیا آپ کا نام محمد ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے کہا: اے عبدالمطلب کے بیٹے، میں آپ سے چند سوال دوٹوک انداز میں کروں گا۔ آپ میرے ان سوالات کا برا مت مانیے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محسوس نہیں کروں گا، تم جو چاہو، پوچھو۔ اس نے کہا: میں آپ کو اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو آپ کا خدا ہے اور جو آپ سے پہلے والوں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قبلك واله من هو كائن بعدك، اللّٰه امرك ان تامرنا ان نعبده وحده لا نشرك به شياء، وان نخلع هذه الانداد التى كانت آباؤنا يعبدون معه؟ قال: اللهم، نعم. قال: فانشدك اللّٰه الهك واله من كان قبلك واله من هو كائن بعدك اللّٰه امرك ان نصلى هذه الصلوات الخمس؟ قال: اللهم، نعم. قال: ثم جعل يذكر فرائض الاسلام، فريضة الزكاة والصيام والحج وشرائع الاسلام كلها، يناشده عند كل فريضة كما يناشده فى التى قبلها. حتى اذا فرغ، قال: فانى اشهد ان لا اله الا اللّٰه واشهد ان سيدنا محمدا رسول اللّٰه، وساؤدى هذه الفرائض واجتنب ما نهيتنى عنه، ثم لا ازيد ولا انقص. قال: ثم انصرف راجعا الى بعيره، فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حين ولى: ان يصدق ذو العقيصتين، يدخل الجنة۔

(رقم ۲۳۸۰)

کا اور آپ کے بعد والوں کا خدا ہے، کیا اللہ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اللہ اس پر گواہ ہے۔اس نے کہا: میں آپ کو اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو آپ کا خدا ہے اور جو آپ سے پہلے والوں کا اور آپ کے بعد والوں کا خدا ہے، کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمیں بتائیں کہ ہم تنہا اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ان خداؤں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آبا کیا کرتے تھے۔آپ نے فرمایا: ہاں، اللہ اس پر گواہ ہے۔اس نے کہا: میں آپ کو اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو آپ کا خدا ہے اور جو آپ سے پہلے والوں کا اور آپ کے بعد والوں کا خدا ہے، کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمیں پانچ نمازوں کی ہدایت فرمائیں؟ آپ نے جواب دیا: ہاں، اللہ اس پر گواہ ہے۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے اسلام کے فرائض کے بارے میں دریافت کرنا شروع کیا۔اس ضمن میں اس نے زکوٰۃ، روزہ اور قوانین اسلام کے بارے میں پوچھا۔ان کے بارے میں سوال کرتے ہوئے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح قسم لی جیسا کہ پہلے سوالوں میں لی تھی۔ بالآخر وہ سوالات سے فارغ ہو گیا۔اس کے بعد اس نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور ہمارے سردار محمد اللہ کے رسول ہیں۔ میں ان تمام فرائض کو بجا لاؤں گا اور ان چیزوں سے اجتناب کروں گا جن سے آپ نے منع فرمایا ہے اور میں اپنی طرف سے ان میں نہ کوئی اضافہ کروں گا اور نہ کمی۔ پھر وہ اپنے اونٹ کی طرف لوٹا۔آپ نے دیکھا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تو فرمایا: اگر یہ دو چوٹیوں والا آدمی سچ کہتا ہے تو جنت میں

داخل ہوگا۔"

کم وبیش یہی متن حسب ذیل مقامات پر بھی نقل ہوا ہے:

مسلم، رقم ۱۲۔ ترمذی، رقم ۶۱۹۔ نسائی، رقم ۲۰۹۱۔ احمد ابن حنبل، رقم ۱۲۴۷۹، ۱۳۰۳۴۔ دارمی، رقم ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۲۴۰۱، ۵۸۶۳۔ بیہقی، رقم ۸۳۹۴۔ ابن حبان، رقم ۱۵۵۔ ابویعلیٰ، رقم ۳۳۳۳۔

۳۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں 'رجل من اھل نجد' (اہل نجد میں سے ایک شخص) کی جگہ 'اعرابیا' (ایک بدو) اور بعض مثلاً مسلم، رقم ۱۲ میں ان کی جگہ 'رجل من اھل البادیة' (صحرائی علاقے کا ایک آدمی) کے الفاظ آئے ہیں۔

۴۔ 'فقال یا رسول اللّٰہ اخبرنی ماذا فرض اللّٰہ علی من الصلوٰۃ؟' (اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول، مجھے بتایئے کہ اللہ نے مجھ پر نماز کے حوالے سے کیا فرض کیا ہے؟) کا جملہ جو بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں بیان ہوا ہے، سوال کے طور پر بخاری، رقم ۴۶ میں ان الفاظ میں آیا ہے: 'یسال عن الاسلام'۔ (وہ اسلام کے بارے میں سوال کر رہا تھا)۔

۵۔ 'فقال اخبرنی ما فرض اللّٰہ علی من الصیام' (اس نے پوچھا: مجھے بتایئے کہ اللہ نے مجھ پر روزوں کے بارے میں کیا فرض کیا ہے؟) کے الفاظ بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں نقل ہوئے ہیں۔

۶۔ 'صیام شھر رمضان' (ماہ رمضان کے روزے) کے الفاظ بخاری، رقم ۲۵۳۲ میں آئے ہیں۔ بخاری، رقم ۴۶ میں ان کی جگہ 'و صیام رمضان' (اور رمضان کے روزے) اور بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں 'شھر رمضان' (ماہ رمضان) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۷۔ 'فقال اخبرنی بما فرض اللّٰہ علی من الزکوٰۃ' (اس نے سوال کیا: اللہ نے مجھ پر زکوٰۃ کے سلسلے میں کیا فرض کیا ہے؟) کا جملہ بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں نقل ہوا ہے۔

۸۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں 'الزکوٰۃ' (زکوٰۃ) کی جگہ 'شرائع الاسلام' (قوانین اسلام) کے الفاظ آئے ہیں، جبکہ ابوداؤد، رقم ۳۹۱ میں 'الصدقة' (صدقہ) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۹۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں 'لا ازید علی ھذا و لا انقص' (میں ان میں نہ اضافہ کروں گا اور نہ کمی کروں گا) کی جگہ 'لا اتطوع شیاء و لا انقص مما فرض اللّٰہ علی شیاء' (میں ان میں نہ کسی نفلی عمل کا اضافہ کروں گا اور نہ اللہ کی طرف سے عائد کسی فرض میں کچھ کمی کروں گا۔) کا جملہ نقل ہوا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۰۔'لا ازید علی هذا و لا انقص "(میں ان میں نہ اضافہ کروں گا اور نہ کمی کروں گا) کے بعد 'منه' (اس میں سے) کے الفاظ مسلم، رقم ۱۱ میں نقل ہوئے ہیں۔

۱۱۔بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۱۷۹۲ میں 'افلح ان صدق' (اگر یہ سچا ہے تو فلاح پائے گا۔) کی جگہ 'دخل الجنة ان صدق' (اگر یہ سچا ہے تو جنت میں داخل ہوگا۔) کے الفاظ آئے ہیں۔ جبکہ چند روایات میں 'افلح و ابیه ان صدق' (اگر یہ سچا ہے تو یہ اور اس کا باپ فلاح پائیں گے۔) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ بظاہر سہواً نقل ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

اہل قدر سے قطع تعلق

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۱۰۸۔۱۰۹)

عن عمر رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: لا تجالسوا أهل القدر ولا تفاتحوهم.

''حضرت عمر رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل قدر کے ساتھ نہ بیٹھو اور نہ انھیں حاکم بناؤ۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

لا تفاتحوهم: فتح کے معنی کھولنے، واضح کرنے اور فیصلہ کرنے کے ہیں۔ باب مفاعلہ میں آخری معنی کے اعتبار سے اس میں حکم بنانے اور فیصلہ لینے کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے گفتگو کا آغاز کرنے، سلام میں پہل کرنے یا مناظرہ کرنے کے معنی لیے ہیں۔ ہمارے نزدیک پہلے معنی لفظ کے عمومی استعمال کے مطابق ہیں۔ بیان کیے گئے دوسرے معانی درحقیقت اس کے تحت ہیں۔ اس سے مختلف یا متضاد نہیں ہیں۔

متون

یہ روایت تمام کتب حدیث میں کم وبیش انھی الفاظ میں روایت ہوئی ہے۔ صرف ابن ابی عاصم کی السنہ میں 'لا

تـفاتحوهم' کی جگہ'لا تقاعدوهم' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ الفاظ بھی'لا تجالسوهم' کے ہم معنی ہیں۔غرض یہ کہ اس روایت کا اصلاً ایک ہی متن دستیاب ہے۔

معنی

یہ روایت جس گروہ سے متعلق ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جیسا کہ ہم روایت ۱۰۵ کے تحت لکھ چکے ہیں، مضمون ہی سے واضح ہے کہ اس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت محل نظر ہے۔مزید براں سند کے ضعف کے باعث اس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت مزید مخدوش ہو جاتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ محدثین کے کام کے نتیجے میں کتب حدیث میں کا حصہ نہ بن گئی ہوتی تو اسے بطور قول رسول کے زیر بحث لانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

گمان یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں جب یہ گروہ سامنے آیا تو اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا گیا۔ یہ روایات اسی شدید ردعمل کا ریکارڈ ہیں۔

شارحین روایت کو قرآن مجید کے ان احکامات کی قبیل سے قرار دیا ہے جو قرآن مجید میں یہود اور مشرکین کی دشمنی اور فتنہ پردازی واضح ہونے کے بعد اہل اسلام کو دیے گئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اہل اسلام کے لیے لازم ہے کہ وہ باطل اور باطل کی قوتوں کے ساتھی نہ بنیں، لیکن اہل اسلام ہی میں ظاہر ہونے والے کلامی اور فقہی گروہوں کو دشمن اسلام قرار دینا محل نظر ہے۔

کتابیات

ابوداؤد، رقم ۴۰۸۷، ۴۰۹۷۔احمد، رقم ۲۰۱۔ابن حبان، رقم ۷۹۔مستدرک، رقم ۲۸۷۔بیہقی، رقم ۲۰۶۶۲۔ ابو یعلیٰ، رقم ۲۴۵۔السنہ لابن ابی عاصم، رقم ۳۳۰۔

چھ ملعون

عـن عـائشة رضـی اللہ عـنهـا قـالـت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه

وسلم: ستة لعنتهم ولعنهم الله وكل نبی يجاب: الزائد فی كتاب الله، والمكذب بقدر الله، والمتسلط بالجبروت ليعز من أذله الله ويذل من أعزه الله، والمستحل لحرم الله، والمستحل من عترتی ما حرم الله، والتارك لسنتی.

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ ہیں جن پر میں نے لعنت کی اور اللہ تعالیٰ نے لعنت کی۔ اور ہر نبی کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ اللہ کی کتاب میں اضافہ کرنے والا، اللہ کی تقدیر کا انکار کرنے والا، زبردستی حاکم بننے والا تاکہ وہ جسے اللہ نے معزز کیا، اسے رسوا کرے اور جسے اللہ نے رسوا کیا، اسے معزز بنائے، اللہ کی محرمات کو حلال کرنے والا، میرے خاندان پر وہ (تعدی) حلال کرنے والا جسے اللہ نے حرام کہا ہے، اور میرے طریقے کو چھوڑنے والا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

ستة: چھ، اس کا معدود اشخاص یا اقوام محذوف ہے۔ یہ مبتدا ہے اور 'لعنتهم' والا جملہ اس کی خبر ہے۔ نکرۂ موصوفہ اس صورت میں بھی مبتدا بن جاتا ہے جب اس کی صفت محذوف ہو۔

الزائد فی كتاب الله: قرآن مجید میں ایسی بات داخل کرنے والا جو اس میں نہ ہو۔ یہ اضافہ لفظی بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بھی۔

المتسلط بالجبروت: 'تسلط' کے معنی غالب آنے، قبضہ کرنے اور قدرت حاصل کرنے کے ہیں۔ یہاں یہ اقتدار میں آنے کے معنی میں ہے۔ 'جبروت' 'جبر' سے 'فعلوت' کے وزن پر ہے اور اس میں مبالغے کا مفہوم بھی ہے۔ اس کے معنی قہر و جبر کے ہیں۔

عترتی: میرا خاندان۔ 'عترة' کا اطلاق قریبی اعزہ و اقارب پر ہوتا ہے۔

متون

یہ روایت معمولی فرق کے ساتھ کتب حدیث کا حصہ بنی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک روایت میں ترتیب بیان قدرے مختلف

ہے۔ایک روایت میں نبی کے ساتھ ’مجاب‘ کی صفت کا اضافہ ہے۔ایک روایت میں ’قدر‘ کی جگہ اس کی جمع ’اقدار‘ کا لفظ آیا ہے۔اسی طرح ایک روایت میں ’المتسلط‘ کے بدلے میں ’المسلط‘ کا لفظ آیا ہے۔اس روایت کے کسی متن میں کوئی معنی خیز کمی بیشی نہیں ہے۔

معنی

ہمارا دین کے ساتھ تعلق ہمارے کردار میں جو بنیادی خصوصیات پیدا کرتا ہے، یہ روایت ان سے انحراف کی صورتوں کو واضح کرتی ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہدایت ہے۔قیامت تک کے لیے اب یہی حق کے پہچاننے کی کسوٹی اور خدا کی مرضیات کو جاننے کا ذریعہ ہے۔اس میں لفظی یا معنوی تحریف درحقیقت ایک طرف لوگوں کے لیے سامان گمراہی کی فراہمی ہے اور دوسری طرف دین سازی ہے اوران دونوں جرموں کی شناعت کسی توضیح کی محتاج نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ایک حی وقیوم خدا کے ساتھ تعلق ہے۔ہم یہ بات جانتے اور مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کو براہ راست دیکھ اور چلا رہے ہیں۔یہ ایک علیم وحکیم پروردگار کی کائنات ہے۔اس میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے، سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور وہ اپنی حکمت کے مطابق ہونے والے کو ہونے دیتے اور جسے چاہتے ہیں، روک دیتے ہیں۔یہ حقیقت ہے جسے تقدیر کے لفظ سے روایات میں واضح کیا گیا ہے، جو شخص اسے نہیں مانتا اس کے اللہ تعالیٰ پر ایمان کی کوئی حقیقت نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مشاورت کو اسلام کے اجتماعی نظام کا اصل الاصول قرار دیا ہے۔اقتدار میں تبدیلی کا عمل بھی مشاورت کے تحت ہے۔چنانچہ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والا اس اصول سے انحراف کرتا ہے۔اس کی یہ روش اس بنیادی قدر کے انہدام کا باعث بنتی ہے جس میں اجتماعی زندگی کی تمام برکات مضمر ہیں۔مزید براں اس کا اگلا جرم یہ ہے کہ اقتدار کے اصل حق داروں کا حق تلف کرتا اور کچھ دوسروں کو وہ مناصب دے دیتا ہے جو اس کے حق دار نہیں تھے۔علاوہ ازیں اس کارروائی میں بسا اوقات کچھ جانیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔یہ قتل کسی قانونی استحقاق کے بغیر ہوتا ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ اس جرم کی سزا قرآن مجید کی رو سے ابدی جہنم ہے۔یہ اور اس طرح کے دوسرے پہلو ہیں جو اقتدار کے حصول کے لیے کی گئی اس کارروائی کو انتہائی سنگین جرم بنا دیتے ہیں۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس واضح ارشاد کے باوجود خلافت راشدہ کے بعد سے لے کر آج تک کی ہماری تاریخ اقتدار پر زبردستی قبضہ کرنے والوں ہی کی تاریخ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لینا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ نا دین سے انحراف کے مترادف ہے۔ظاہر ہے جس نے دین کو چھوڑ دیا، وہ لعنت کے علاوہ کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں کا احترام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہمارے دل میں موجود محبت اور عقیدت کے جذبات ہی کی توسیع ہے۔ یہ محبت اور عقیدت کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق کی صحیح اساس ہے۔اس سے ہمارا ایمان قوت پاتا اور ہمارا عمل اسوۂ رسول کی پیروی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے بارے میں کوئی بری روش نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق میں کمی کی قیمت پر اختیار کی جا سکتی ہے۔ یہی چیز اسے شنیع بنا دیتی ہے۔بعض شارحین نے عترت سے خانوادۂ علی رضی اللہ عنہ مراد لیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

کتابیات

ترمذی، رقم ۲۰۸۰۔ابن حبان، رقم ۵۷۴۹۔المستدرک، رقم ۱۰۲،۹۳، ۴۷۱۱، ۴۷۱۱، ۳۹۴۱۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

عروج وزوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۱)

عروج وزوال کے قانون سے آگہی کی اہمیت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عروج وزوال اس دنیا کا ایک غیر متبدل واقعہ ہے۔ دنیا میں ہر شے عروج کی خواہش منداوراسی راہ کی مسافر ہے، مگر ہر عروج کا مقدر ہے کہ ایک روز وہ زوال کی آغوش میں جا گرے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ جس کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ انسان کا اپنا وجود اس کا سب سے بڑا گواہ ہے۔ ہم اس دنیا میں ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے ایک حقیر گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں آتے ہیں۔ ایک ایسے وجود کی شکل میں جو اپنے عجز کا بیان آپ ہوتا ہے۔ شعروادب کے شاہکار تخلیق کرنے والا انسان بھی اس دور میں بے معنی چیخ پکار کے سوا اظہار مدعا کی دوسری صورت نہیں پاتا۔ تاہم یہی عاجز انسان مناسب غذا اور تحفظ ملنے پر نشوونما پاتا ہے۔ وہ اٹھنا اور بیٹھنا، ہنسنا اور بولنا، چلنا اور دوڑنا، کھیلنا اور جھگڑنا سیکھتا ہے۔ وہ تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کا شعور آگہی کے نت نئے معرکے سر کرتا ہے۔ پھر بچپن کی دہلیز عبور کر کے وہ لڑکپن کے حدود میں قدم رکھتا ہے۔ ابھی تک صرف مطالبات کرنے والا بچہ والدین کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔ وہ دوڑ دوڑ کر ان کے کام کرتا ہے۔ ماں باپ سے لینے والا اب انھیں کچھ دینے بھی لگتا ہے۔

اسی سعی وجہد میں جوانی اس کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ وہ احساسات وجذبات کی ایک نئی دنیا دریافت کرتا ہے۔ توانائی کا ایک انتھک خزانہ اس کے اندر سے ابلنے لگتا ہے۔ زندگی کو وہ ایک ایسے روپ میں دیکھتا ہے جو اس سے قبل اس نے دیکھا نہ اس کے بعد دیکھ سکے گا۔ وہ ستاروں پر کمند ڈالنے کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ عظمت کی بلندیوں کو چھونا چاہتا ہے۔

اس کے بلند عزائم کے آگے ہر رکاوٹ ہیچ ہوتی اور ہر مشکل آسان ہوتی ہے۔ وہ معاشرے میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ اپنی معاش کی راہ تلاش کرتا ہے۔ اس کی بے پناہ قوتیں اسے مجبور کرتی ہیں کہ اب وہ بھی صفحۂ ہستی پر اپنا عکس بکھیرے۔ اس کے لیے وہ ایک خاندان کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کی ذمہ داریوں کا کوہِ گراں اپنے کندھوں پر اٹھالیتا ہے۔ اب وہ نئی زندگیوں کا محافظ ہوتا ہے۔ مگر اسی دوران میں اس کے اپنے عروج کو زوال کا غیر محسوس سایہ گہنانے لگتا ہے۔ جوانی کی فولادی سیاہی کو بڑھاپے کا سفید زنگ لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ ضعف بڑھتا ہے اور اسے لاغر و ناتواں کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے مقام پر آجاتا ہے جہاں وہ خود محسوس کرتا ہے کہ اب زوال کی تاریک رات ابدی ہوتی جارہی ہے۔ اس کے حوصلے جواب دے دیتے ہیں۔ وہ عوارض جن سے اس کا وجود آگاہ نہیں تھا، اسے چار طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ وہ بیماریاں جنھیں اس نے کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا تھا، اب اس کی جان کا روگ بن جاتی ہیں۔ اب کوئی غذا زندگی بخش رہتی ہے اور نہ کوئی دوا صحت بخش۔ آخر کار یہ روگی موت کے ہاتھوں شکست کھا کر وادی عدم میں اتر جاتا ہے۔ یوں عروج و زوال کا یہ قصہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

عروج و زوال کے اس قانون کے بارے میں جو عالم جمادات، عالم نباتات، عالم حیوانات اور عالم انسانیت میں یکساں طور پر جاری و ساری ہے، دو باتیں واضح رہنی چاہییں۔ اول جیسا کہ اوپر کی مثال سے ظاہر ہے کہ یہ تدریجی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ اس کو تقویت اور ضعف دینے والے بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ دوسری ہر چیز کی طرح عروج و زوال کا قانون بھی اسباب کے پردے میں منصۂ شہود پر جنم لیتا ہے۔ ہر عروج کے پیچھے کچھ متعین اسباب ہوتے ہیں اور ہر زوال بہرحال کچھ بنیادیں رکھتا ہے۔ ان اسباب و علل کا سلسلہ کسی بنا پر اگر متاثر ہو جائے تو واقعات اپنی رفتار اور ترتیب بدل لیا کرتے ہیں۔ پھر موت بچپن میں بھی آجاتی ہے اور عالم پیری میں بھی اولاد ہو جایا کرتی ہے۔ پھر ایک نوجوان بھی ضعف کی تصویر نظر آسکتا ہے اور ایک کہن سال شخص پر بھی نوجوانی کا رنگ چڑھ سکتا ہے۔

عروج و زوال کے اس قانون سے ہم واقف ہوں یا نہیں، اس کے پابند ضرور ہیں۔ دوسری ہر چیز کی طرح وہ قوم بھی، جس کے ہم فرد ہیں اور وہ معاشرہ جس کا ہم جز ہیں، اسی راہ کے مسافر ہیں۔ ایک قوم پر وہ سارے ادوار کم و بیش اسی طرح گزرتے ہیں جس طرح ایک انسان پر۔ جزئیات میں یقیناً فرق ہے، مگر اصول میں یہ واقعہ قوم کی زندگی میں بھی لازماً پیش آتا ہے۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے، مگر اس وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو جاننے کی قومی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ مان لیا کہ اس دنیا میں قوموں کا عروج و زوال کچھ مخصوص خدائی ضابطوں کے تحت روبہ عمل ہوتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ وہ کیا فرق ہے جو اس حقیقت کو جاننے اور نہ جاننے سے پیدا ہو جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ دنیا خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں رہنے اور ترقی کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ یہاں خدا کے بنائے ہوئے قوانین سے موافقت کرتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ جو لوگ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ کامیابی حاصل کرتے ہیں

اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، وہ بربادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔قوموں کے بارے میں خدا کے بنائے ہوئے عروج وزوال کے قانون کی بھی یہی حیثیت ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی قوم کو اس قانون سے استثنا مل جائے ،مگر جو قومیں اس قانون اور اس کے پس پردہ کام کرنے والے اسباب وعلل کو سمجھ لیتی ہیں، وہ عروج کی منزلیں جلد اور زیادہ توانائی کے ساتھ طے کرتی ہیں۔ان کے اقبال کا زمانہ طویل اور زوال کا دور ممکنہ حد تک دور ہو جاتا ہے۔ہم آگے چل کر بعض مغربی اقوام کے حوالے سے یہ بتائیں گے کہ کس طرح عصر حاضر میں وہ اس قانون سے واقفیت کی بنا پر اپنے زوال کے فطری عمل کو موخر کر رہی ہیں۔

عروج وزوال کے قانون سے آگہی کی اہمیت کو ایک اور پہلو سے دیکھیں۔ہم پیچھے یہ بتا چکے ہیں کہ یہ قانون تدریجی طور پر قوموں میں اثر دکھاتا ہے۔کسی قوم کے عروج وزوال کا واقعہ ایک دن میں رونما نہیں ہوتا ، بلکہ اس دوران میں قوم مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ یہ عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی کہ وہ اس کے حالات کا مشاہدہ کر کے یہ بتائیں کہ قوم اس وقت کس مرحلہ میں ہے۔ یہ کام رہنماؤں کا ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو جانیں اور اسی اعتبار سے قوم کے اہداف ومقاصد اور لائحۂ عمل کا تعین کریں۔مثال کے طور پر ایک بچے سے اس کے والدین یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ نکاح کرے اور ان کے آنگن میں مزید بچوں کی خوشیاں بکھیرے۔اسی طرح کوئی شخص اپنا کاروبار اپنے ناسمجھ لڑکے کے حوالے نہیں کرتا، کیونکہ اس طرح نقصان کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔

تاہم قوم کے معاملے میں ناعاقبت اندیش رہنما ٹھیک اسی طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ قوم کے مرحلۂ حیات سے ناواقفیت کی بنا پر اس کے سامنے ایسے مقاصد رکھ دیتے ہیں جو اس کی استعداد سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ قوم جو ابھی اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں ہوتی ، اسے اکھاڑے کے میدان میں کسی پہلوان قوم سے بھڑا دیا جاتا ہے۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناکامی اس قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔اسی طرح قوموں کے عروج وزوال کی حقیقی بنیادوں سے ناواقف رہنما نہ ان کو لاحق امراض کی صحیح تشخیص کر پاتے ہیں اور نہ مناسب علاج۔ وہ نہ بھرپور غذا دے پاتے ہیں اور نہ وقت پر دوا۔اس کے بعد قوم کمزور ہو جاتی ہے۔اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، مگر کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا۔ایک بیمار کے سامنے طبل جنگ بجایا جاتا ہے اور ایک ناتواں اور ناسمجھ بچے کو دنیا کی امامت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، اسے الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عالم اسلام بالخصوص مملکت خداداد پاکستان پر ایک نظر ڈالنے سے باقی کہانی سامنے آجاتی ہے۔

مختصراً یہ کہ کسی قوم کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کے لیے اس کے حالات سے درست آگہی جتنی ضروری ہے، اتنا ہی قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں خدائی قانون کا گہرا شعور بھی لازمی ہے۔ چنانچہ اگلے صفحات میں ہم اس قانون کے ان مختلف پہلوؤں کی وضاحت کریں گے جو ہمیں تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتے ہیں اور جن کا براہ راست تعلق ہماری قوم سے ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قوموں کی زندگی میں عروج وزوال کے مراحل

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دھرتی پر سدا ایک قوم کا اقتدار نہیں رہتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خدا نے حکومت واقتدار کو ہمیشہ ایک رنگ، نسل، گروہ، خاندان یا قوم کے لیے مختص کر دیا ہو۔ ہر خطۂ ارض پر مختلف قومیں اور ملتیں آباد رہی ہیں جن میں قوت وحشمت کے لحاظ سے فرق رہا ہے۔ بعض قومیں اپنے معاصرین سے قوت واقتدار میں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ اپنے قرب وجوار میں رہنے والی اقوام پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کا یہ غلبہ اس قدر بڑھتا ہے کہ موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق وہ اپنے وقت کی سپر پاور بن جاتی ہیں۔ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی اور اقوام عالم ان سے جان کی امان پا کر ہی اپنے معاملات چلاتی ہیں۔ تاہم ایک وقت کے بعد اس قوم کو زوال آتا ہے۔ سپر پاور کی جگہ کسی اور سپر پاور کے لیے خالی ہو جاتی ہے۔ ناواقف لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک یا ایک سے زیادہ سپر پاورز کا موجودہ معاملہ صرف آج شروع ہوا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب انسانوں نے گروہوں کی شکل میں رہنا شروع کیا تھا اور آج کے دن تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ مصری، ایرانی، یونانی، رومی، عرب، ترک، یورپین، روسی اور اب امریکی سب اسی سلسلۂ عروج وزوال کی کڑیاں ہیں۔

سپر پاورز کے علاوہ دیگر اقوام بھی عروج وزوال کے اس سلسلے سے گزرتی ہیں، مگر وہ تاریخ عالم میں اس لیے زیادہ نمایاں حیثیت نہیں رکھتیں کہ ان قوموں کا عروج وزوال اپنے ظہور کے لیے بڑی حد تک سپر پاورز ہی کا محتاج رہا ہے۔ ورنہ ہر قوم بہر حال اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے جس میں اس کا ایک متعین آغاز ہوتا ہے۔ وہ ترقی کے مراحل طے کرتی ہے اور عروج کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی مسند کمال پر براجمان ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت کے بعد زوال سے دوچار ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے بیان کیا کہ قوموں کا یہ عروج وزوال تدریجی عمل کے بعد جنم لیتا ہے۔ اس لیے اس بحث میں سب سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعیت کے ساتھ متعین کیا جائے کہ ایک قوم کے عروج وزوال کے دوران میں اسے کن کن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اور ان مراحل میں وہ کن حالات وکیفیات سے گزرتی ہے۔

یہاں ہم اس بات کی وضاحت کرنا چاہیں گے کہ ضروری نہیں کہ ہر قوم یکساں طور پر ان تمام مراحل سے گزرے۔ ایک تاریخی عمل میں اتنے زیادہ عوامل ومحرکات کام کر رہے ہوتے ہیں جن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محرکات حالات، زمانہ اور لوگوں کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے ایک تاریخی مرحلہ اپنی ظاہری ہیئت کے اعتبار سے ہر قوم میں مختلف انداز میں ظہور کرتا ہے۔ بعض جگہ یہ بہت واضح ہوتا ہے اور بعض جگہ بہت مبہم۔ بعض اقوام میں یہ بہت طویل ہوتا ہے اور بعض میں بہت مختصر۔ چنانچہ ہم کوشش کریں گے کہ قوموں کے مراحل حیات بیان کرتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت میں ان قوموں کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مثالیں پیش کریں جن کی زندگی میں یہ مراحل بہت واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں اور جن کے حالات سے لوگ عام طور پر آگاہ ہیں۔

ا۔ دور تشکیل

قوموں کی زندگی کا پہلا مرحلہ تشکیل کا ہوتا ہے جس سے قبل وہ گم نامی کا شکار ہوتی ہیں۔ لفظ گم نامی سے ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کی طرح قوم عدم سے وجود میں نہیں آتی۔ ایک جدید قوم کے عناصر ترکیبی بہر حال پہلے سے موجود ہوتے ہیں جو مختلف عوامل کے زیر اثر ایک قوم کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ قوموں کی تشکیل کا نقطۂ آغاز بالعموم جنگ و فتح اور پناہ و ہجرت کا کوئی واقعہ یا کوئی مذہبی و سیاسی عمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کا دھارا اپنا کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کوئی تاریخ دان تو نہیں تھے، مگر ان کا یہ جملہ کہ پاکستان اسی روز بن گیا تھا جس روز برصغیر کا پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا، تاریخ کے اس قانون سے ان کی واقفیت کی دلیل ہے۔

قوموں کے دور تشکیل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ان کا ایک اجتماعی مزاج تشکیل پاتا ہے۔ تشکیل کے اس مرحلے میں کام کرنے والے عوامل ان گنت اور بالعموم بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ یہ عوامل ایک طویل عرصے تک عمل کرتے ہیں اور انھی کے زیر اثر کسی قوم کا مذکورہ بالا خاص مزاج تشکیل پاتا ہے جسے ہم اس کی قومی نفسیات کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ قومی نفسیات ہوتی ہے جو اگلے تمام مراحل میں اس قوم کے رویے کا تعین کرتی ہے۔ اس بات کو آپ انسان کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کی رائے یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی تشکیل دور طفولیت میں ہی ہو جاتی ہے۔ جسے بعد میں بدلنا آسان نہیں ہوتا اور جس کے اثرات تا زیست انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہم ایک قوم کی تاریخ کے حوالے سے تشکیل کے مرحلے کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افریقہ نسل انسانی کا اولین گہوارہ اور دریائے نیل انسانی تہذیب کا ابتدائی مسکن سمجھا جاتا ہے۔ مصر میں انسانی آبادی کے دریافت ہونے والے قدیم ترین آثار ڈھائی سے ایک لاکھ سال ق م پرانے ہیں۔ انسانی تمدن نے چیونٹی کی چال سے اپنا سفر طے کیا اور آہستہ آہستہ پتھر کے اوزار وجود میں آنا شروع ہوئے جو تیس ہزار سال قبل مسیح تک بہت بہتر ہو گئے۔ قریباً دس سے پانچ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان مصری معاشرہ گاؤں اور قصبہ کے دور میں داخل ہوا اور ایک قوم کے آثار ابھرنے لگے۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ پہلی دفعہ مصر میں ایک متحدہ ریاست بنی۔ اور اس کے بعد مصری قوم نے عروج کی سیڑھیاں طے کرنی شروع کیں۔ اپنے دور عروج میں انھوں نے زمین پر ایسے آثار چھوڑے جن کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اہرام مصر اور ابوالہول آج کے دن تک عظمت کی اس داستان کو سنانے کے لیے موجود ہیں۔ یہاں تک کہ تین ہزار سال تک نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد اس وقت مصر کی انفرادی حیثیت کا خاتمہ ہوا جب ۲۳ ق م میں مصر کی آخری حکمران قلو پطرا کو رومی فوج کے ہاتھوں شکست ہوئی اور مصر رومی حکومت کا ایک حصہ بن گیا۔

تشکیل کے پورے مرحلے میں مصری قوم نے کسی جزیرے پر تنہا زندگی نہیں گزاری، بلکہ وہ اسی دنیا کا حصہ رہی جہاں دوسرے انسان بھی بستے ہیں۔ وہ فطرت کی ان قوتوں کے ماتحت تھی جو انسانی زندگی پر فیصلہ کن اثرات ڈالتی رہتی ہیں۔ اس لیے مصری قوم نے دوسری اقوام کا اثر بھی قبول کیا اور فطرت کی طاقتوں کے تحت اپنی زندگی کا نقشہ ترتیب دینے پر بھی مجبور ہوئی۔ وہ بار باران ہجرتوں سے متاثر ہوئی جو افریقی قبائل نے مصراور ایشیا کی طرف کیں۔ یا وہ ہجرتیں جو ایشیائی باشندوں نے نیل کی وادی کی طرف خوراک کی تلاش میں کیں۔ اسے جنگ وجدل سے بھی سابقہ پیش آیا اور تیر جیسا جدید ہتھیار مصریوں نے بارہ ہزار ق م میں ہی بنالیا تھا، جبکہ یورپ میں تیر کئی ہزار سال بعد بنا۔ نیز سیلاب، زلزلے، قحط وغیرہ بھی مصریوں کی زندگی پر اثر ڈالتے رہے۔ چنانچہ مصریوں نے فطرت کے پیدا کردہ حالات اور دوسری تہذیبوں کے اثرات کے زیر اثر اپنا ایک قومی مزاج پیدا کیا جس نے صدیوں میں جا کر ایک قوم کی تشکیل کی۔ اس قومی مزاج کے اثرات ان کے فنون لطیفہ، فن تعمیر، مذہبی تصورات اور طرز حکومت میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہی وہ قومی مزاج تھا جس نے مصریوں کو نہ صرف دوسری اقوام سے ممتاز کیا، بلکہ خود دوسری اقوام نے مصریوں کا بے حد اثر قبول کیا۔

۲۔ تعمیر وشناخت کا دور

کسی قوم کا دور تشکیل صدیوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ تاہم جب ایک قوم اس مرحلے سے گزر جاتی ہے تو وہ اپنی ایک انفرادی شناخت بنالیتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب قوم کے مختلف گروہ اپنی الگ الگ خصوصیات کو بتدریج ایک قومی حوالے میں ضم کر دیتے ہیں۔ یہ قومی حوالہ اس قوم کا اجتماعی قومی مزاج ہوتا ہے۔ جس کے زیر اثر قوم کے افراد میں وہ جدید خصوصیات پیدا ہونے لگتی ہیں جو انھیں دوسری اقوام سے ممتاز کرتی ہیں۔ وہ عصبیت جسے ابن خلدون غیر معمولی اہمیت دیتا ہے، اب واضح طور پر قومی جذبات میں نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے اندر سے ایسے زندہ افراد پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو اپنی قوم کو سر بلندی اور عظمت کے مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ اسے اقوام عالم میں ممتاز دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری اقوام کے مقابلے میں اس کی برتری کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس دور میں مختلف شعبہ ہاے حیات میں قوم کے افراد نمایاں کارنامے سرانجام دینے لگتے ہیں۔

اس مرحلے پر قوم واضح طور پر اپنے لیے ایک راہ عمل کا تعین کرتی ہے۔ اس سے قبل زمانہ اس کا فاعل تھا، مگر اب وہ اپنی راہ خود تلاش کرتی ہے۔ دور تشکیل میں چونکہ قوم حالات کے رحم وکرم پر ہوتی ہے، اس لیے اچھی یا بری، دونوں خصوصیات اور رویے قوم میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن تعمیر کا مرحلہ آنے پر ایسے مصلحین اٹھتے ہیں جو قوم کی رہنمائی کر کے اسے یہ بتاتے ہیں کہ کون سی خوبیاں ایسی ہیں جو انھیں اپنے اندر برقرار رکھنی چاہییں اور وہ کون سی خصوصیات ہیں جن سے اسے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ اس کے قومی مزاج کی تشکیل نو کرتے ہیں۔

ایسا نہیں ہوتا کہ اس دوران میں تاریخ اور فطرت اپنا عمل چھوڑ دیتے ہیں۔ مسائل اب بھی سر اٹھاتے ہیں، حادثات اب

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بھی جنم لیتے ہیں۔ ہر آن قوم کو نت نئے چیلنجز درپیش رہتے ہیں، مگر اب قوم میں وہ میکنزم جنم لے لیتا ہے جو ہر مشکل موقع پر قوم کے ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر رہے کہ لازماً قوم ان تمام چیلنجز سے کامیابی سے عہدہ برا ہو جاتی ہے جو اس کے قومی وجود کو درپیش ہوتے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ اب قوم میں حالات کا جواب دینے کی اور اپنے تحفظ و بقا کی جنگ لڑنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس دور میں کسی قوم کو دھچکے بھی لگتے ہیں، ترقی معکوس کی سی کیفیت بھی بعض اوقات پیش آ جاتی ہے، لیکن اگر قوم میں جان ہے اور حالات کا جبر اس کی استعداد سے باہر نہیں تو آخر کار وہ بحران کی کیفیت سے باہر نکل آتی ہے۔ بحران کی یہ کیفیت اندرونی حالات کے تحت بھی پیش آتی ہے اور کسی خارجی چیلنج کی بنا پر بھی۔ یہ مرحلہ تشکیل کے دور کی طرح طویل تو نہیں ہوتا، مگر بے حد ہنگامہ خیز ہوتا ہے جس میں قومی زندگی مسلسل ایک تلاطم سے دوچار رہتی ہے۔ دراصل یہی ہنگامہ خیزی اور حالات کا دباؤ ہوتا ہے جو اس قوم کے اندر وہ امکانات پیدا کر دیتا ہے جو مستقبل میں اس کے عروج کا سبب بنتے ہیں۔ اگر قوم اس دباؤ کا سامنا کامیابی سے کر لیتی ہے تو اس کے بعد اس کے لیے ترقی و استحکام کی راہیں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر پاتی تو یا صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا پھر ایک طویل عرصے کے لیے کاروبارِ عالم سے بے نیاز ہو کر ایک معذور کی طرح دوسروں کی دی ہوئی زندگی کی بھیک پر جیتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس دور میں قوم میں زندہ افراد پیدا ہوتے ہیں جو ایک طرف قوم کی ذہنی اور عملی تعمیر کرتے ہیں اور دوسری طرف ان چیلنجز سے نبرد آزما ہوتے ہیں جو قومی وجود کی بقا کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔

اس دور کی ایک نمایاں مثال مسلمانوں کی تاریخ میں اس دور سے ملتی ہے جو حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوتا ہے اور عبدالملک بن مروان کے دور تک چلا جاتا ہے۔ یہ چالیس سالہ دور انتہائی ہنگامہ خیز ہے جس میں خلافت راشدہ کے خاتمہ اور نواسۂ رسول کی مظلومانہ شہادت کے واقعات بھی ہوتے ہیں، مگر اس کے باوجود بنو امیہ کی بیدار مغز قیادت تمام مسائل پر قابو پا کر امت مسلمہ کو ترقی و عظمت کی راہوں پر ڈال دیتی ہے۔

اس دور کی ایک اور نمایاں مثال یورپ کے عروج کے عمل میں ہمیں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور مذہبی اصلاح (Reformation) کے دور میں نظر آتی ہے۔ عین اس وقت جب یورپی اقوام بادشاہ، پوپ اور جاگیرداروں کے شکنجہ میں آخری حد تک جکڑ گئی تھیں، وہاں مسلمانوں کے اثر سے قومی تعمیر کا عمل شروع ہو گیا۔ ان میں مسلسل ایسے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوتے گئے جنھوں نے یورپ کو ایک نئی شناخت اور نئی زندگی دی اور یوں یورپی اقوام کے عروج کی بنیاد رکھ دی۔

۳۔ دور ترقی و استحکام

جو قومیں دور تعمیر میں پیش آیندہ چیلنجز کا سامنا کامیابی سے کرتی ہیں، اس کا ثمر ان کی نسلیں دور ترقی و استحکام میں چکھتی ہیں۔ تعمیر کے پر پیچ اور ناہموار راستوں سے گزرنے کے بعد استحکام کا وہ ہموار دور آتا ہے جس میں زندگی کی گاڑی انتہائی

تیزی سے آگے کی سمت دوڑتی ہے۔قوم پچھلے مرحلے کی کامیابیوں کے نشے سے چور ہوتی ہے۔اس کے زخم اسی طرح بھرتے ہیں جس طرح کسی نوجوان کے زخم تیزی سے مندمل ہوتے ہیں۔اپنے اوپر اس کا اعتماد غیر معمولی ہو جاتا ہے۔اب اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے بازووں میں کتنا زور ہے۔ چنانچہ بنو امیہ کی مندرجہ بالا مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ بحران سے نمٹنے کے فوراً بعد، عبدالملک کے بیٹے ولید کے دور میں مسلمان ایک طرف اسپین اور ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور دوسری طرف ان کی فتوحات کا سیلاب چین تک پہنچ گیا۔

اس دور میں قوم کا ہر فرد بایقین ہوتا ہے اور پوری قوم مل جل کر قومی تعمیر کے کام میں حصہ لیتی ہے۔اول تو راہ کی مشکلات، خصوصاً اندرونی مشکلات، پیش نہیں آتیں۔اور اگر آتی بھی ہیں تو قوم ایک اجتماعی جذبہ سے ان کا سامنا کرتی ہے۔اس دور میں زندگی کا نظام مستحکم ہوتا ہے۔اداروے فروغ پاتے ہیں۔معاشی ترقی ہوتی ہے۔امن وامان کی کیفیت بہت اچھی ہوتی ہے۔دنیا کے سامنے ایک طاقت ور قوم کا نقشہ سامنے آنے لگتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں واقع چینی قوم اس وقت ٹھیک اسی مرحلے سے گزر رہی ہے۔

اس مرحلے پر قوم کے سامنے دو طرح کے حالات آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ترقی و استحکام کا یہ سلسلہ طویل عرصہ تک یونہی جاری رہتا ہے اور قوم اس کی عادی ہو جاتی ہے۔آنے والی نسلیں اس سکون کے زیر اثر اس توانائی سے محروم ہونا شروع ہو جاتی ہیں جس کے سہارے ان کے آباء نے یہ استحکام حاصل کیا تھا۔قوم کو کوئی داخلی یا خارجی چیلنج درپیش نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں وہ بلند نظر قائدین پیدا ہوتے ہیں جو اس کے لیے اعلیٰ مقاصد کا تعین پیدا کریں۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب اس قوم نے اپنا عروج دیکھ لیا اور اب اس کے قویٰ کو زنگ لگنے لگا ہے۔جس کے بعد انحطاط کے اس دور کا آغاز ہو جاتا ہے جس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ہمارے اپنے دور میں اس کی ایک بڑی اچھی مثال جاپانی قوم کی ہے۔جس کی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ یہ مستقبل کی ایک عظیم حکومت اور ایک سپر پاور کی شکل اختیار کرے گی۔اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا تو قبل از وقت ہوگا، لیکن بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دور انحطاط شروع ہو چکا ہے۔

دوسرا امکان یہ ہوتا ہے کہ عین اس دور میں جب کہ قوم اپنے شباب پر ہو اس کے سامنے ایسے حالات پیش آئیں جو اسے اپنی توانائیوں کے استعمال کا بہترین موقع فراہم کر دیں۔جس کے بعد وہ قوم عروج کی اس منزل کی طرف بڑھتی ہے جسے ہم آج کی زبان میں سپر پاور کا منصب کہتے ہیں۔

۴۔ دور عروج و کمال

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، عروج کا آغاز بھی چیلنج سے ہوتا ہے۔ یہ داخلی بھی ہوتا ہے جب کہ کسی زبردست ہلچل کے بعد قوم کی قیادت ایک نیا اور تازہ دم گروہ سنبھالتا ہے اور قوم کے سامنے ایسے مقاصد رکھتا ہے جو اس کی ابلتی ہوئی توانائیوں کو ایک نیا میدان عمل دے دیتے ہیں۔ یا بعض اوقات قوم کو اپنے دور استحکام میں خارج میں کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے یا پھر کوئی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عظیم مقصد اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ایک دفعہ پھر وہ بلا خوف وخطر آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور بالعموم سرخ رو ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ قوم ایک نئی توانائی کے ساتھ دنیا کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے۔ پھر اس کا اقتدار صرف اپنے ملک تک محدود نہیں رہتا، بلکہ ارد گرد کے تمام علاقے میں پھیل جاتا ہے۔ اب وہ حقیقی معنوں میں زمانے کی فاعل بن جاتی ہے۔ دوسری اقوام اس کے آگے سر اطاعت خم کرنے پر خود کو مجبور پاتی ہیں۔ اس کا اقتدار فوجی اور سیاسی ہی نہیں، بلکہ معاشی اور تہذیبی بھی ہوتا ہے۔ اقوام عالم اب اس سے علم وہنر سیکھتی ہے۔ ان کی زبان اس کا اثر قبول کرتی ہے۔ ان کا طرز زندگی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہوتا جہاں وہ دوسری اقوام کو متاثر نہ کرے۔ وہ اس سے نفرت تو کرتی ہیں، مگر اس کے اثرات سے خود کو بچا نہیں سکتیں۔ اس وقت صورت حال 'انا و لا غیری' کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

عرب حکومت میں اس کا ایک بڑا اچھا نمونہ عباسی خلافت میں ہارون الرشید کا دور حکومت تھا۔ عباسی امویوں کو ہٹا کر اقتدار میں آئے تھے۔ ابتدائی حکمران ابو العباس سفاح، منصور اور مہدی وغیرہ حکومت کے استحکام میں مصروف رہے۔ جس کے بعد ہارون الرشید تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں ایک طرف تو علوم وفنون کے میدان میں غیر معمولی ترقی شروع ہوئی اور دوسری طرف وہ قیصر روم تک سے خراج وصول کرتا تھا۔ اس کے اقتدار کی عظمت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے بادل کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر کہا تھا کہ تو جہاں دل چاہے جا کر برس، تیری پیداوار کا خراج میرے پاس ہی آئے گا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۵۔ دور انحطاط

دور عروج کی ہر چیز بہت اچھی ہوتی ہے سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ زوال لازمی لگا ہوتا ہے۔ عروج کی یہ عجیب و غریب تاثیر ہے کہ وہ غیر محسوس طریقے پر بہت جلد انحطاط میں بدل جاتا ہے۔ اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں بلند نظر افراد پیدا ہونا ختم نہیں تو کم ضرور ہو جاتے ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، ان کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ تاہم دور انحطاط کی کوئی ظاہری علامت نہیں ہوتی، بلکہ عیش وعشرت، فارغ البالی، آسانی وراحت میں یہ دور باقی تمام ادوار سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر ایک سکون کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ظاہر بین نگاہیں تو حالات دیکھ کر یہ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کہ انحطاط شروع ہو چکا ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ گویا قوم دور استحکام میں جی رہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ عروج کی چڑھائی کے فوراً بعد قوم کی گاڑی آہستہ آہستہ اس راستے پر آ جاتی ہے جو ایک غیر محسوس ڈھلان پر واقع ہوتا ہے۔ اور یہ زوال کی ڈھلان ہوتی ہے۔

دورِ انحطاط کی ایک اچھی مثال خلافت عثمانیہ کے تاجدار سلیمان عالی شان کے دور حکومت کے بعد کا زمانہ ہے۔ سلیمان اعظم کا اقتدار دنیا کے تین براعظموں پر محیط تھا۔ اس وقت تک خلافت عثمانیہ کو تقریباً تین سو سال ہو چکے تھے اور وہ تین سو سال

تک مزید اقتدار میں رہی۔ سلیمان کے مرنے کے فوراً بعد اس کے اقتدار میں کوئی فرق نہیں پڑا، بلکہ یورپ کو عثمانیوں کے خلاف اپنی پہلی فتح حاصل کرنے کے لیے مزید ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ لیکن اس دوران میں خلافت کا دور انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ اس کے خاتمے میں اتنی دیر اس لیے ہوئی کہ یورپ نے نیند سے بیدار ہونے میں کافی وقت لیا۔

موجودہ زمانے میں اس دور کی ایک بڑی اچھی مثال امریکا کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ امریکا نے اپنے عروج کی انتہا دیکھنے کے بعد انحطاط کی ڈھلان پر قدم رکھ دیا ہے۔ تاہم امریکی قیادت انتہائی زندہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انحطاط کے عمل کو روکنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ قوم کے سامنے ہمہ وقت کوئی نہ کوئی چیلنج رہنا چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنی سہولت سے کوئی سافٹ ٹارگٹ چنتے ہیں اور اس کو قوم کے سامنے چیلنج کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ اس سافٹ ٹارگٹ کو ختم کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، مگر وہ اسے مشکل سے مشکل بنا کر اپنی قوم کو دکھاتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جو ان کے انحطاط کو نمایاں نہیں ہونے دے رہا، بلکہ ان کے عروج کے عظیم تر اور طویل تر ہونے کا تاثر دے رہا ہے۔

۶۔ دور زوال

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انحطاط کا دور بہت خاموشی سے دور زوال میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دراصل عروج کا لازمی نتیجہ رفاہیت اور سیاسی غلبہ کا لازمی نتیجہ معاشی استحکام ہوتا ہے۔ معاشی استحکام قوموں میں ان طریقوں کو رواج دیتا ہے جس میں ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں عیش و عشرت کے ہاتھوں زنگ آلود ہونے لگتی ہیں۔ ایک بڑی اور عظیم سلطنت کی بقا و استحکام کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ناپید ہونے لگتی ہے۔ وہ بڑے افراد جو دور انحطاط میں کم ہو جاتے ہیں، اب اکا دکا ہی رہ جاتے ہیں۔ طاؤس و رباب قوم کے اعصاب پر اس طرح سوار ہوتا ہے کہ شمشیر و سناں اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ عظیم تر مقاصد کی خاطر تکلیفیں جھیلنے کا داعیہ ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مختلف امراض گھن کی طرح قومی وجود کو کھانا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ وہ دور ہوتا ہے جب اپنے پرائے سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب اس مریض کا خاتمہ قریب آ گیا ہے۔ چنانچہ کبھی اندرونی خلفشار قومی استحکام میں دراڑیں ڈال دیتا ہے اور کبھی خارجی حملہ آور قومی زندگی کی بنیادوں کو ہلا ڈالتے ہیں۔ ملک کا جغرافیہ قوم کی توانائیوں کی طرح محدود ہو جاتا ہے اور اس کی طاقت اس کے حوصلے کی طرح معدوم ہو جاتی ہے۔ ماضی قریب میں اورنگ زیب کے بعد کی مغلیہ سلطنت کی تاریخ اس کا بہت واضح نمونہ ہے۔

ایسے میں ایک قوم اکثر اپنی بقا کے لیے دوسری قوموں کی توانائیاں مستعار لیتی ہے۔ یہ عمل ممکن ہے کہ کسی قوم کی ڈوبتی نبض کو کچھ عرصے تک سہارا دے دے، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ قومی زوال کی سب بڑی علامت ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسری قوم جب آتی ہے تو صرف اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں ہی ساتھ نہیں لاتی، بلکہ وہ اپنے خیالات، نظریات، حوصلے اور میلانات بھی ساتھ لاتی ہے۔ یہ سب آہستہ آہستہ اس قوم کے اقبال کا سورج غروب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دور میں بعض مغربی

اقوام اس اصول سے واقف ہونے کی بنا پر اجنبی قوموں کو اپنے اندر صرف ایک حد تک آنے کی اجازت دیتی ہیں۔ وہ انھیں قوم کی گاڑی کے کل پرزوں کے طور پر استعمال کرتی ہیں اور حتی الامکان انھیں ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں آنے دیتیں۔ تاہم اس سے زوال کا عمل موخر تو ہو سکتا ہے، مگر قدرت کا قانون بدل نہیں سکتا۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جب زوال کا آغاز ہو جاتا ہے تو سوائے تباہی کے ہر دوسرا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ زوال ہمیشہ داخلی کمزوری سے شروع ہوتا ہے اور کوئی خارجی طاقت اسے دور نہیں کر سکتی۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر مغلیہ سلطنت کے زوال پر نگاہ ڈال لیجیے۔ اورنگ زیب کے بعد آنے والا زوال کسی کے روکے نہ رکا۔ یہاں تک کے شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر خاص طور پر ہندوستان بلایا تاکہ مرہٹوں کا زور ٹوٹ جائے۔ مرہٹوں کا زور تو اس نے توڑ دیا، مگر وہ کتنوں کا زور توڑتا؟ تھوڑے عرصے میں انگریز آندھی طوفان کی طرح پورے ملک پر چھا گئے۔ ٹھیک یہی معاملہ اندلس میں ہوا۔ جہاں دور زوال کے آغاز پر مراکش کے مسلمانوں نے پہلے یوسف بن تاشفین کی زیر قیادت مرابطین کی شکل میں اور پھر موحدین کی صورت میں مسلمانان اندلس کو عیسائیوں کے غلبے سے بچانے کی کامیاب کوششیں کیں۔ مگر کب تلک؟ موحدین کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی ساری مسلم ریاستیں ایک ایک کر کے عیسائیوں کے قبضے میں چلی گئیں۔

۷۔ تباہی اور خاتمہ

دور زوال کتنا ہی طویل ہو، مگر آخر کار تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ لیکن یہ خاتمہ اور تباہی کب ہوگی، اس کا انحصار مختلف عوامل پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات کوئی قوم مذکورہ بالا طریقے کو استعمال کر کے یعنی خارجی مدد اور نئے خون کے ذریعے سے قومی جسد کو مصنوعی تنفس فراہم کرتی ہے جس سے اس کی عمر کچھ طویل ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات حکمران حکمت عملی سے کام لیتے ہیں اور ممکنہ حد تک تباہی کو ٹال دیتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال غرناطہ کے حکمرانوں کا طرز عمل تھا۔ انھوں نے چاروں طرف سے عیسائیوں میں گھرے ہونے کے باوجود حکمت عملی کے ساتھ ٹکراؤ سے پرہیز کیا اور ڈھائی سو سال تک غرناطہ اندلس کے مسلمانوں کی آخری جائے پناہ بنا رہا۔ بعض اوقات ایک قوم کا زوال تو شروع ہو جاتا ہے، مگر اسے چیلنج کرنے والی کوئی دوسری قوم سامنے نہیں آتی، اس لیے ایک طویل عرصے تک وہ قوم دور زوال میں جی لیتی ہے۔ مثلاً خلافت عثمانیہ کا خاتمہ تو بہت پہلے مقدر ہو گیا تھا، مگر ابھی یورپی اقوام اتنی مستحکم نہیں ہوئی تھیں کہ اس کی جگہ لے سکیں۔ اس لیے اسے کافی مہلت عمر مل گئی۔ ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ ایسے تصورات اقتدار کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں جو اسے مقدس بنا دیتے ہیں۔ جن کی بنا پر کوئی دوسری قوم اس کو ختم کرنے کی ہمت نہیں کر پاتی۔ اس کی سب سے نمایاں مثال خلافت عباسیہ ہے جو دو صدیوں میں ہی اپنی طبعی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ مگر خلافت کا تقدس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کا ایسا تصور لوگوں کے ذہن میں راسخ تھا کہ اگلی تین صدیوں تک کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اس کے خاتمہ کا سوچ سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ مریض زبان حال سے کہہ رہا تھا:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دل کا جانا ٹھہر گیا اب صبح گیا کہ شام گیا

آخر کار اس لب گور مریض کو داخل گور کرنے کا فریضہ ہلاکو خان نے سرانجام دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود ہلاکو خان خلیفہ کے قتل میں متردد تھا کہ کہیں کوئی آفت اس قتل کی بنا پر نہ ٹوٹ پڑے۔ مگر ابن علقمی کی حوصلہ افزائی پر وہ اس قتل پر آمادہ ہوا۔ تاہم اسے ہاتھوں سے قتل کرنے کے بجائے گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندھا گیا۔

اسی طرح خاتمہ میں تاخیر کا ایک سبب جغرافیائی حالات بھی ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے خلافت راشدہ کے دور میں ہی کسریٰ کی ایرانی حکومت کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے رومیوں کو ان کے اکثر یا تمام ایشیائی اور افریقی مقبوضات سے بے دخل کر دیا تھا۔ تاہم ان کا مرکز قسطنطنیہ صدیوں تک اپنے انتہائی محفوظ جائے وقوع کی بنا پر مسلمانوں کی یلغار سے محفوظ رہا۔ آخر کار پندرھویں صدی میں سلطان محمد فاتح نے غیر معمولی جنگی حکمت عملی اور جدید ترین جنگی ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے اس ناقابل تسخیر مہم کو سر کیا اور یوں رومی اقتدار کے بجھتے دیے کو ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔

اس بحث کے اختتام پر ہم قارئین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اوپر ہم نے قوموں کی زندگی میں آنے والے مراحل حیات کی شرح و وضاحت کے لیے ایک سپر پاور کی زندگی کے مراحل کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی میں مندرجہ بالا سارے مراحل لازماً آتے ہیں۔ تاہم ضروری نہیں کہ ہر قوم ان تمام مراحل سے گزرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قومی زندگی کے بعض مراحل ظاہری حالات کے اعتبار سے بالکل مشابہ ہوتے ہیں۔ مثلاً دور تعمیر کی ہلچل اور دور زوال کا ہنگامہ بعض اوقات بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ اسی طرح انحطاط و استحکام کے ادوار کی یکسانی بعض اوقات اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی ہم عصر یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ یہ قوم اس وقت کہاں کھڑی ہے۔ یہی ایک مورخ اور قائد کا فرق ہوتا ہے کہ مورخ ماضی میں جھانک کر کسی قوم کی گزشتہ تاریخ لکھتا ہے، جبکہ ایک حقیقی قائد مستقبل میں جھانک کر قوم کی ایک نئی تاریخ رقم کرتا ہے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد بلال

ابوشعیب صفدرعلی کی یاد میں

جو والدین مال و دولت چھوڑ کر دنیا سے رخصت نہیں ہوتے، اکثر ان کی اولاد انھیں تمام عمر کوستی رہتی ہے۔ وہ شکن آلود چہرے اور شکوہ آمیز لہجے میں یہی کہتی ہے کہ ہمارے والد نے تو ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔لیکن وہ اس معاملے میں دنیا سے بالکل مختلف آدمی تھے۔ وہ اصل دولت اور اصل جائداد سے واقف تھے۔ان کے والد مولانا نقش بند ایک گاؤں کی مسجد میں مولوی تھے۔مختلف لوگ اپنے گھروں سے ان کے لیے روٹیاں بھیجا کرتے تھے۔نکاح پڑھانے کی کچھ خدمت کر دیا کرتے تھے۔ جنازہ پڑھانے پر کچھ کپڑے وغیرہ دے دیا کرتے تھے۔ان کے والد تھے تو مولوی ہی، مگر ''مولوی'' اپنے لغوی مفہوم میں، نہ کہ اصطلاحی مفہوم میں۔انھوں نے یہ روٹیاں، پیسے اور کپڑے، سب کچھ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔بطور استاد زمین داروں سے معاوضہ وصول کرنا بھی بند کر دیا۔وہ گھاس کاٹتے اور منڈی میں جا کر فروخت کرتے۔اس کے علاوہ ایک اسکول میں پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔اس کے باوجود گھر میں بہت غربت تھی۔بعض اوقات گھر میں کھانا نہ پکتا۔ بچوں کو تھوڑے سے دودھ میں پانی ڈال کر،اس کے ساتھ روٹی کھلا دی جاتی۔بچوں کے اسکول کی معمولی فیس دینے کے لیے ادھار لینا پڑتا۔لیکن اس کے باوجود دین و اخلاق کی دولت حاصل کرنا ان کی پہلی ترجیح رہی،جس کے نتیجے میں انھیں اوران کی اولاد کو غیر معمولی عزت ملی۔گاؤں میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو کوئی تھانے نہ جاتا،ایسے تمام مسائل مسجد میں ان کے والد کے پاس آتے اور وہ مسجد ہی میں انھیں نمٹا دیتے۔بڑے بڑے رئیس راہ چلتے ان کے سامنے آجاتے تو ان کے گھٹنوں کو چھو کر گزرتے۔ان کی عورتیں کسی گلی سے گزرتیں اور سامنے سے کوئی مرد آجاتا تو واپس مڑ جاتا اور ان کے لیے گلی خالی کر دیتا۔لیکن گھر میں غربت پوری طرح موجود تھی۔اسی غربت کا ترکہ چھوڑ کر یہ مولوی صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔لیکن ان کے یہ برخوردار شکوہ سنج نہیں ہوئے، بلکہ اپنے والد کے لیے یہ شعر کہے:

وہ مرشد مرے اور استاد بھی ہیں
نہاں خانۂ دل میں آباد بھی ہیں

رگوں میں مری ان کا خوں دوڑتا ہے
میری فکر صالح کی بنیاد بھی ہیں

مولانا نقش بند کے اس فرزند صالح کا نام ہے، صفدر علی گوندل۔

آہ! ۲۲ جولائی ۲۰۰۲ کو پیر کے روز صبح ساڑھے چار بجے صفدر صاحب وفات پا گئے۔ ان کی عمر ۶۲ برس تھی۔ وہ استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے شاگرد ہی نہیں، ان کی علمی تحریک کے ابتدائی اور بہت قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ غامدی صاحب کے رسائل ''الجریدہ'' اور ''الاعلام'' میں ان کا نام سرورق پر شائع ہوتا رہا ہے۔ غامدی صاحب بتاتے ہیں کہ ابتدا میں میرے اور ان کے مابین اتفاق زیادہ اور اختلاف بہت کم تھا، لیکن آہستہ آہستہ اختلاف بڑھتا گیا اور اتفاق بہت کم رہ گیا، لیکن اس کے باوجود باہمی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

صفدر صاحب کا تعلق ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں دھریمہ سے تھا۔ وہیں ایک اسکول میں استاد بھی رہے۔ مڈل تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ باقی تعلیم نجی طور پر حاصل کی۔ مڈل ہی سے خطابت کا آغاز کر دیا۔ ۴۲ برس کی عمر میں ایم اے اسلامیات کیا۔ وہ گورنمنٹ کالج، سرگودھا میں استاد تھے۔ والد صاحب جماعت اسلامی کے رکن ہونے کے علاوہ امیر ضلع بھی تھے۔ صفدر صاحب جماعت اسلامی کے کارکن تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

گھر والوں کو ان کی جان لیوا بیماری کا علم ان کی وفات سے ایک مہینا قبل ہوا، جب ان کی آنکھوں کا رنگ پیلا ہوا تو گھر والوں کو یرقان کا اندیشہ ہوا۔ ٹسٹ وغیرہ کرائے گئے۔ یرقان کی تصدیق نہ ہو سکی، لیکن یہ زیادہ پریشانی کی بات تھی۔ پھر دیگر ٹسٹ ہوئے۔ جگر اور پتے کے درمیانی حصے میں کینسر کی تشخیص ہوئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ سرجری سے وہ تین مہینوں سے پانچ برس تک زندہ رہ سکتے ہیں، ورنہ یہ چند ہفتوں کی بات ہے، لیکن سرجری سے معذوری کی کوئی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ صفدر صاحب سرجری کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔

ڈاکٹر کہتے تھے کہ کینسر کی علامتیں یہ ہیں کہ مریض کو بخار ہو جاتا ہے، جسم کے مختلف حصوں میں شدید درد ہوتا ہے، معذوری کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، بھوک ختم ہو سکتی ہے، کھانا کھانا مشکل ہو سکتا ہے۔ لیکن وفات سے دو دن پہلے تک انھیں کوئی بخار نہیں تھا، کوئی درد نہیں تھا، بھوک پوری طرح لگ رہی تھی، کھانا کھا رہے تھے، نماز پڑھ رہے تھے، لطیفے سنا رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ ہاں آخری دنوں میں کچھ کم گو ہو گئے تھے، مگر ایسا نہیں تھا کہ وہ دوستوں میں بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی لطیف بات ان کی زبان پر نہ آئے۔

صفدر صاحب ایک سوچنے والے انسان تھے۔ ان کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کے اندر پائی جانے والی خوبیوں کا انکار نہیں کر سکتا۔

جو بات صفدر صاحب کے نزدیک حق قرار پا جاتی تھی، وہ اس پر پوری قوت کے ساتھ عمل کرتے تھے۔ اس معاملے میں

کوئی خوف، کوئی ترغیب، کوئی ناراضی، کوئی محبت، کوئی عقیدت، ان کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی تھی۔

ایک دفعہ جماعت کا ایک اجتماع منعقد ہو رہا تھا۔ وہ صحت منداور عظیم الجثہ آدمی تھے۔ انھیں وہاں گارڈ مقرر کیا گیا۔ اجتماع کا یہ اصول تھا کہ پنڈال میں وہی شخص داخل ہوسکتا تھا جس کی قمیض پر بیج لگا ہوا ہو۔ وہ گیٹ پر کھڑے تھے۔ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنے قریبی احباب کے ساتھ وہاں آئے اور پنڈال کے اندر داخل ہونے لگے۔ ان کی قمیض پر بیج نہیں تھا۔ صفدر صاحب نے اپنا ہاتھ امیر جماعت کے آگے کر دیا اور سپاٹ لہجے میں بولے: ''بابا جی، آپ اندر نہیں جا سکتے۔'' گردوپیش کے لوگ حیران اور پریشان ہوگئے: ''بھئی یہ امیر جماعت، مولانا مودودی ہیں۔'' مگر صفدر صاحب کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انھوں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا: ''میرے لیے یہ اجنبی ہیں۔ یہاں کا اصول یہ ہے کہ پنڈال میں وہی شخص داخل ہوسکتا ہے جس کی قمیض پر بیج لگا ہوگا۔'' بالآخر بیج حاصل کیا گیا، مولانا مودودی کی قمیض پر لگایا گیا، تب صفدر صاحب نے انھیں اندر آنے کی اجازت دی۔

صفدر صاحب، جناب جاوید احمد غامدی کے شاگرد تھے، ان کے رسالے میں ان کے معاون تھے، لیکن رجم کے معاملے میں غامدی صاحب سے اختلاف ہوگیا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسی رسالے میں غامدی صاحب کے مضمون کے ساتھ ان کا تنقیدی مضمون بھی شائع ہوا۔

ایک زمانے میں گورنمنٹ کالج، سرگودھا کی مسجد میں ایک ہر دل عزیز شخصیت جمعہ کا خطبہ دیتی تھی۔ ان کے بعد بہت سے خطبا کو آزمایا گیا، لیکن بات نہ بن سکی۔ قاضی خاور حسین اعوان ایڈووکیٹ بتاتے ہیں ''ایک جمعہ پر جب میں کالج کی مسجد میں حاضر ہوا تو ایک نئے صاحب منبر پر بیٹھے تقریر فرما رہے تھے۔ میں اسے بھی کالج انتظامیہ کی تجرباتی اسکیم کا ایک حصہ سمجھ کر مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ گیا، تقریر کی طرف میری قطعاً توجہ نہ تھی۔ میں اپنے خیالات میں گم بیٹھا تھا کہ مقرر کا ایک جملہ زناٹے کے ساتھ میری کانوں سے ٹکرایا۔ منبر پر بیٹھے خطیب صاحب فرما رہے تھے کہ حضرات گرامی میں اگر اللہ کا کوئی ایسا حکم جس میں اس نے اپنے جلال اور غضب کا اظہار فرمایا ہو، اسے نرم اور شریں کر کے آپ کی سماعت کی نذر کروں، صرف اس خوف سے کہ سخت باتیں کرنے پر کہیں آپ لوگ مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں اور مجھے اگلا جمعہ پڑھانے سے روک نہ دیں تو صاحبان جان لیجیے کہ ایسا کر کے میں بد دیانتی کا مرتکب ہوں گا۔ اور میں اپنے اس فریضہ سے عہدہ برآ نہیں ہوں گا جو منبر رسول پر بیٹھنے کے بعد مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں نے یہ جملہ سن کر پہلی بار خطیب صاحب کو غور سے دیکھا، وہ سفید سادہ سے لباس میں ملبوس تھے۔ قمیض کے کف کھلے تھے۔ سر پر مدرسے کے عام طالب علموں جیسی معمولی سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ نظر کی عینک کے پیچھے چھپی موٹی موٹی آنکھوں میں ذہانت کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ لہجہ ضرورت کے مطابق کبھی سخت ہو جاتا تھا اور کبھی نرم۔ مگر الفاظ بڑے نپے تلے تھے۔ میں نے باقی تقریر بڑے غور سے سنی۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ مقرر نے مجھے سننے پر مجبور کر دیا...... اس نئے خطیب نے ہم جیسے ٹیڑھے لوگوں کے ''ٹیڑھ'' نکالنے شروع کر دیے۔ باوجود اس کے کہ ان کی باتیں بڑی سخت ہوتی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تھیں اور میرے جیسے گناہ گار انسان کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہر بات مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں، لیکن پھر بھی میں ان کی تقریر شروع ہونے سے پہلے مسجد پہنچ جاتا تھا۔''

ایک بیٹے نے کامرس کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھیں ایک بنک میں ایک اچھی ملازمت مل گئی ـــــــ ہمارے معاشرے کے عام لوگ بنک کی ملازمت حاصل کرنے کے لیے ترستے ہیں ـــــــ صفدر صاحب نے بیٹے کو یہ ملازمت کرنے کی اجازت نہیں دی۔ انھوں نے کہا: ''اگرچہ ہم حکومت سے جو تنخواہیں لیتے ہیں، اس میں بالواسطہ سود شامل ہوتا ہے، لیکن آپ بنک کی نوکری کر کے براہ راست سودی نظام کو چلانے والے تو نہ بنیں۔'' صفدر صاحب چاہتے تو ملک میں بے روزگاری کو جواز بنا کر بیٹے کو بنک کی نوکری کی اجازت دے سکتے تھے، جس کا ظاہر ہے کہ انھیں بھی مالی فائدہ ہوتا، لیکن انھوں نے خود بھی عزیمت کی راہ اختیار کی اور بیٹے کو بھی عزیمت کی راہ دکھائی۔ لہٰذا اس بیٹے کو ایک اسکول میں ۱۶ ویں گریڈ کی نوکری کرنی پڑی۔

ان کے برخوردار شعیب احمد جب ان کے ساتھ کسی معاملے میں بحث کرتے تو پوچھتے: دلیل کیا ہے؟ وہ جواب دیتے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ شعیب پوچھتے: اس کی مصلحت؟ جواب ملتا: بس کہہ دیا کہنے والے نے۔ تم ڈھونڈتے پھرو مصلحت۔

جب وہ ریٹائر ہوئے تو اس وقت انھوں نے اپنے ایک بھائی، ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کی شادی کرنی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ معمولی ذمہ داری نہیں تھی۔ لیکن اس موقع پر حکومت کی طرف سے انھیں جو رقم ملی اس کا بڑا حصہ لینے سے انکار کر دیا کہ یہ سود ہے۔ کہا: کام تو اللہ کرتا ہے اور کام ہو جاتے ہیں۔

صفدر صاحب ایک حس جمال رکھنے والے آدمی تھے۔ فطرت، انسان، ادب، غرض یہ کہ جہاں خوب صورتی پاتے تو اس سے بہت متاثر ہوتے، لیکن اس کے باوجود شریعت کی پوری پابندی کرتے تھے۔ واقعی اصل جہاد یہ ہے۔ ان کا مزاج انھیں ایک طرف کھینچتا تھا اور شریعت انھیں دوسری طرف۔

افغانستان میں پچھلے دنوں جو کچھ ہوا، اس کو انھوں نے دل سے لگا لیا تھا، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انھیں اس کا روگ لگ گیا تھا۔ جمعہ کے خطبے میں وہ خود بھی روتے اور مخاطبین کو بھی رلاتے۔ ان کا نقطۂ نظر حکومتی موقف سے مختلف تھا۔ وہ حکومت کے ملازم تھے، سرکاری کالج کی مسجد کے خطیب تھے، سرکاری اقامت گاہ میں رہتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ اپنا موقف کھل کر بیان کرتے اور حکومت پر سخت تنقید کرتے تھے۔

استاد شاگرد کے تعلق کے معاملے میں صفدر صاحب مشرقی مزاج کے آدمی تھے۔ وہ استاد کو غیر معمولی مقام و مرتبہ دیتے تھے۔

شعیب صاحب کے بقول وہ استاد کی اتنی عزت کرتے تھے کہ استاد شرمندہ ہو جاتا تھا۔ شعیب صاحب بتاتے ہیں کہ ایک

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دفعہ میرے ایک استاد نے مجھے بہت مارا۔ میں ابا جی کے پاس آ گیا اور شکایت کی۔ ابا جی نے کہا: چلو چلتے ہیں ان کے پاس۔ وہ استاد کے پاس آئے اور بولے: اسے اگر مارنا ہی تھا تو اتنا مارنا تھا کہ یہ آپ کی شکایت کرنے کے قابل نہ رہتا۔

ان کے دوست خواجہ کفایت اللہ سدیدی بتاتے ہیں: ''آپ صرف پڑھاتے ہی نہ تھے، پڑھتے بھی تھے۔ قدیم عربی پر عبور حاصل کرنے کے لیے غامدی صاحب کی شاگردی بھی فرمائی۔ وہ اپنے کم عمر اور مختصر سے استاد کے سامنے یوں باادب اور دوزانو بیٹھتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ وہ مجھے قرون اولیٰ کے شخص لگتے تھے۔''

ان کے اندر سیکھنے کا شوق غیر معمولی تھا۔ وہ غامدی صاحب کے شاگرد تھے، لیکن عمر میں ان سے کافی بڑے تھے۔ اسی طرح جب انھوں نے یونیورسٹی میں ایم اے کرنے کے لیے داخلہ لیا تو ان کی عمر ۴۲ برس تھی۔ اس عمر میں نوجوانوں کے ماحول میں لوگ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جایا کرتے ہیں اور تعلیم ادھوری چھوڑ دیا کرتے ہیں، لیکن وہ کسی ایسے مسئلے کا شکار نہیں ہوئے اور اپنی تعلیم مکمل کی۔

صفدر صاحب ایک دوست دار آدمی تھے۔

وہ دوستوں کے کام کو اپنا کام سمجھ لیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوتا وہ اپنے گھر کے باہر باغیچے میں چارپائی پر بیٹھے ہوتے تھے۔ کوئی دوست آ گیا۔ بولا: میرے ساتھ راولپنڈی چلیں تو وہ اسی وقت چل پڑتے۔ پھر راستے میں یا راولپنڈی پہنچ کر سوچتے کہ یہاں میرا کون کون واقف ہے جس سے تعاون لے کر اس دوست کی مدد کی جائے۔

وفات سے ایک ہفتہ قبل ان کے ایک دوست گھر آئے ——— یاد رہے کہ صفدر صاحب کو ڈاکٹر یہ کہہ چکے تھے کہ وہ چند ہفتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے ——— صفدر صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے، کسی اور دوست کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ اِس دوست نے ان کے چھوٹے بیٹے کو اپنے ساتھ لیا اور اُس دوست کے ہاں پہنچ گئے اور کہا: میرے ساتھ چلیں۔ پہلے فیصل آباد جانا ہے اور پھر اسلام آباد۔ صفدر صاحب نے کہا: میری ٹوپی گھر پر ہے۔ اس دوست نے کہا: ٹوپی گھر سے لے لیتے ہیں۔ صفدر صاحب ان کے ساتھ گھر آئے۔ ٹوپی لی اور فیصل آباد چلے گئے۔ تین دنوں کے بعد گھر لوٹے ...... اور اس کے چار دن کے بعد فرشتوں کے ساتھ اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے چلے گئے۔

شعیب صاحب کہتے ہیں: ''ہر آدمی کا اپنا ایک زمانہ ہوتا ہے۔ اپنا Age group۔ لیکن اس آدمی کا کوئی Age group نہیں تھا۔ وہ سب کا ہم عمر تھا۔ سب کے ساتھ ان کے برابر۔ میں نے ایسا بہت کم دیکھا ہے کہ کسی آدمی کا احترام اس کے بزرگ کرتے ہوں اور اس سے محبت اس کے ہم عمر کرتے ہوں اور اس کی دوستی کا بھرم نوجوان بھرتے ہوں۔ میں نے اس کے بزرگوں کو اس کے ہاتھ چومتے، اس کے دوستوں کو اس کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے اور نوجوانوں کو اس کے ساتھ محفلیں جماتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' ...... ''جو لوگ تحصیل شاہ پور کے موضع شریفہ میں میرے والد کے جنازے میں شریک ہوئے اور جنھوں نے چھوٹے سے قبرستان کو جانے والی کچی سڑک کے کنارے پر آم کے درخت کے نیچے رکھی ہوئی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چارپائی پر محوِ آرام اس شخص کا آخری دیدار کیا ہے، وہ کیسے بھول سکتے ہیں کہ شدید گرمی میں لیٹے ہوئے اس آدمی کی چارپائی کے آس پاس اس سے محبت کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا جس میں وہ بھی تھے جو اس کے رشتے دار تھے اور وہ بھی جو اس کے رشتے دار نہیں تھے۔ وہ بھی تھے جن کی عمریں ستر سے متجاوز تھیں اور وہ بھی تھے جن کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ اس کی چارپائی کے آس پاس وہ بھی تھے جن کے سروں پر پگڑیاں تھیں اور ان کی داڑھیاں لمبی تھیں اور چہروں پر نور تھا اور وہ بھی تھے جنھوں نے فرنگی لباس پہنے ہوئے تھے اور وہ بھی تھے جنھوں نے تہ بند باندھے ہوئے تھے اور ان کے کندھوں پر چادریں تھیں۔ ہجوم میں وہ بھی تھے جو دور دراز سے اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر آئے تھے اور وہ بھی تھے جو رکشوں، موٹر سائیکلوں، سائیکلوں اور تانگوں پر آئے تھے۔ ہجوم میں وہ بھی تھے جو علی الصبح اپنے اپنے گاؤں سے پیدل چل پڑے تھے اور ان کے جوتے غبار سے اٹ گئے تھے اور ان کے کپڑوں پر اور ان کے چہروں پر گرد اڑ رہی تھی۔''

صفدر صاحب کے ہاں بعض معاملات میں ڈٹ جانے کی عادت میں ایک لچک بھی پائی جاتی تھی۔

شعیب جب میٹرک تک پہنچے تو صفدر صاحب نے انھیں سائنس کے ساتھ میٹرک کرنے کے لیے کہا۔ شعیب نے آرٹس کے ساتھ میٹرک کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ صفدر صاحب نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ میٹرک کا امتحان ہوا اور شعیب فیل۔ اس مسئلے پر پھر باپ بیٹے میں بحث ہوئی۔ مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ پھر امتحان دیا اور برخوردار پھر فیل۔ تیسری دفعہ پھر یہ عمل دہرایا گیا۔ ادھر امتحان لینے والوں نے بھی وہی نتیجہ دہرا دیا۔ تب صفدر صاحب نے شعیب سے کہا کہ ایک دفعہ سائنس کے ساتھ میٹرک پاس کر لو تو اس کے بعد چاہے آرٹس رکھ لینا۔ شعیب نے اس دفعہ امتحان دیا اور پاس ہو گیا اور پھر ایف اے میں داخلہ لے لیا۔

اسی برخوردار نے اپنی پسند کی جگہ پر شادی کرنی چاہی۔ صفدر صاحب نے کہا: اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وقت گزرتا گیا۔ باپ بیٹا اپنے اپنے موقف پر قائم رہے۔ اور پھر ایک دن صفدر صاحب نے شعیب کو اس کی پسند کی جگہ پر شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ شادی کے بعد صفدر صاحب اپنی اس بہو کا زیادہ خیال رکھتے تھے، اسے دوسری بہوؤں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ کہیں یہ محسوس نہ کرے۔

شعیب احمد نے ان کی مطلوب راہ اختیار نہیں کی، لیکن اس کے باوجود صفدر صاحب کو ان کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ایک دفعہ اپنے ایک دوست سے کہنے لگے: تم نے وہ کہانی تو سنی ہو گی کہ جس میں جادوگر کی جان طوطے میں ہوتی ہے۔ ایسے ہی میری جان شعیب میں ہے۔ مجھے اس سے جذباتی لگاؤ ہے۔ وہ اس کے لیے شعر کہتے۔ تحریر لکھتے تو ابوشعیب صفدر علی کے نام سے لکھتے۔ اس کے لیے روتے۔ اس سے ناراض ہوتے۔ اس سے ترک کلام کرتے۔ ناراضی پر بڑا دردانگیز خط لکھتے۔ شعیب کی شعر و شاعری کو پسند نہ کرتے، لیکن اس کی غیر موجودگی میں اپنے دوستوں کو اس کے اشعار سناتے۔ شعیب اپنے والد کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ ایک دفعہ دونوں باپ بیٹا باتیں کر رہے تھے۔ شعیب کو سگریٹ کی طلب ہوئی۔ اندر کی بے چینی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

چہرے سے ظاہر ہونے لگی ۔صفدر صاحب نے صورت حال کو بھانپ لیا۔ بولے : میں تمھاری حالت کو سمجھ رہا ہوں ، لیکن میرے پاس سے اٹھ کر نہ جانا۔ میرے سامنے ہی سگریٹ پی لو۔

صفدر صاحب کی بذلہ سنجی بھی بے مثال تھی ۔

شعیب احمد کا مذہب کی طرف میلان نہ ہوسکا۔ وہ شعروادب کا زیادہ ذوق وشوق رکھتے تھے۔صفدر صاحب اس صورت حال سے بہت پریشان رہتے تھے۔شعیب ایک ذہین طالب علم تھے۔صفدر صاحب انھیں کہتے: تم مجھے جب بتاتے ہو کہ میں فسٹ آیا ہوں تو مجھے خوشی نہیں ہوتی ، کیونکہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی ہوئی ۔ میرے دوسرے بیٹے اپنے فیل ہونے کی خبر سنائیں تو مجھے افسوس نہیں ہوتا، کیونکہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔صفدر صاحب کے بڑے بیٹے کا نام جاوید ہے۔ایک دفعہ صفدر صاحب نے شعیب سے کہا: اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ جاوید سینما گیا ہے تو میں سمجھوں گا کہ وہاں کوئی جہاد کی فلم لگی ہوگی ۔اور اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ تم مسجد میں گئے ہوئے ہو تو میں سمجھوں گا کہ وہاں کوئی ادبی تقریب ہو رہی ہوگی ۔

ایک دفعہ گورنمنٹ کالج ،سرگودھا میں مقابلہ حسن قرأت کا انعقاد ہو رہا تھا۔اس میں لڑکوں اور لڑکیوں ، دونوں نے شریک ہونا تھا۔صفدر صاحب نے اسے درست نہ سمجھا۔انھوں نے انتظامیہ کو اس سے روکنے کی بہت کوشش کی ،مگر کامیابی نہ ہوسکی۔وہ احتجاجاً اس تقریب کا بائیکاٹ کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ راستے میں ہال کی طرف آتے ہوئے ایک پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوگئی ۔پوچھا: کہاں جا رہے ہیں؟ پروفیسر صاحب نے جواب دیا: مقابلہ حسن قرأت دیکھنے ۔صفدر صاحب فوراً بولے: جی ہاں ،مقابلہ حسن و قرأت ۔

انیس مفتی صاحب صفدر صاحب کے دوست ہیں ۔انھوں نے بتایا کہ جب انھوں نے تدفین سے پہلے صفدر صاحب کا آخری دیدار کیا تو اس وقت بھی ایک شرارت آمیز مسکراہٹ ان کے چہرے پر موجود تھی ۔

احسان دانش نے کہا ہے:

موت کے پردے سے کم ہوتی نہیں تابندگی
اس طرف بھی زندگی ہے اس طرف بھی زندگی

ہمیں امید ہے کہ ابوشعیب کی اُس طرف کی زندگی بھی تابندگی سے معمور ہوگی ۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قسمت کا حال پوچھنا

سوال: اکثر یہ سننے میں آیا ہے کہ بعض لوگ مستقبل کی خبریں صحیح صحیح بتا دیتے ہیں۔ کیا اللہ نے انسانوں کو ایسی کوئی خاص صلاحیت عطا کی ہے اور کیا اسلام ایسی باتوں کی اجازت دیتا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایسے لوگوں پر یقین کریں اور ان کی نصیحت پر عمل کریں؟

جواب: مستقبل کے احوال بتانے کے علم نے ابھی سائنس کا درجہ حاصل نہیں کیا اور نہ ایسا ہونے کی امید ہے۔ ہمیں یہ بات کائنات کے بارے میں اللہ کی اسکیم کے خلاف محسوس ہوتی ہے۔ اللہ نے انسانوں کو اس دنیا میں آزمایش کے لیے بھیجا ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ علم ہو جائے کہ کل اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو اس شخص کے لیے تو آزمایش کا پہلو یقیناً ختم ہو جائے گا۔ وہ لوگ جن کے بارے میں ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کے پاس مستقبل بینی کا کوئی خاص فن ہے، وہ اپنی پیشین گوئیوں کی عمارت بالعموم قیاسات پر استوار کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کے اندازے سچ بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے اجتناب کریں اور کوشش کریں کہ ہمیشہ اپنے فیصلے عقل و شعور اور مضبوط دلائل کی بنیاد پر کریں۔ بصورت دیگر ہم توہمات کا شکار ہو کر رہ جائیں گے اور توہمات بہرحال انسان کا تعلق اللہ سے کمزور کر دیتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نامناسب ٹی وی پروگرام

سوال: ٹی وی پروگراموں میں بعض اوقات نیم عریاں لباس اور غیر شایستہ زبان استعمال کی جاتی ہے۔ میرا انھیں دیکھنے کا مقصد کسی سفلی جذبے کی تسکین نہیں، بلکہ محض تفریح ہوتا ہے۔ کیا اسلام ایسے پروگرام دیکھنے کی اجازت دیتا ہے؟

جواب: اسلام چاہتا ہے کہ انسان ممکن حد تک پاکیزہ زندگی گزارے، کیونکہ اللہ کی جنت میں پاکیزہ نفوس ہی داخل ہو سکیں

گے۔اس لیےہمیں چاہیے کہ ہم ہراس عمل سے باز رہیں جو ہمارے تزکیہ میں رکاوٹ بنے۔ چنانچہ ہمیں ایسے پروگراموں کا انتخاب کرنا چاہیے جو ہماری روح اور ہمارے قلوب واذہان کو آلودہ کرنے والے نہ ہوں۔اس معاملے میں ہماراضمیر یقیناً سب سے بہتر فیصلہ کرسکتا ہے۔

غیر مسلم ملک سے حب الوطنی

سوال: کسی غیر مسلم ملک میں رہتے ہوئے کیا مسلمان وہاں کا یوم آزادی منا سکتے ہیں؟ وہ غیر مسلم ملک جہاں ایک مسلمان پیدا ہوا ہو، پلا بڑھا ہو، تعلیم حاصل کی ہو، رہایش پزیر ہو، اوراس کی معاش بھی وہیں سے وابستہ ہو،اس کے بارے میں اس کے کیا جذبات ہونے چاہییں اور اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا ایسی سرزمین کے ساتھ محبت کے جذبات رکھے جاسکتے ہیں اور کیا اس ملک کا پاسپورٹ استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب: کسی بھی ایسے وطن کے ساتھ محبت اور حب الوطنی کے جذبات رکھنا جہاں انسان اپنی زندگی کی بہاریں گزار رہا ہو، فطری بات ہے۔ یہ کسی طرح بھی قابل مذمت نہیں ہے، البتہ ایسی قومی تقریبات میں شرکت سے احتراز کرنا چاہیے جو اسلامی اقدار اور اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوں۔ غیر مسلم ملک کے پاسپورٹ کو استعمال کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مرنے والے کا سوگ

سوال: یہ کہا جاتا ہے کہ مردے پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا منع ہے۔ یہ کیوں منع ہے؟ کیا یہ کسی کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ سوگ یا اظہار افسوس نہ کرے؟

جواب: سوگ یا اظہار افسوس میں تین دن کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص دنیا سے رخت سفر باندھ لے، اس کے لواحقین کو اس سے بقدر رشتہ جو افسوس یا غم ہوتا ہے، وہ ان کے بس میں نہیں ہوتا۔

بخاری کی روایت کے مطابق جب ابراہیم کا وقت رخصت قریب تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم کو اٹھایا، پیار کیا اس حال میں کہ آنسو آنکھوں سے رواں تھے۔ صحابہ میں سے کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ آپ کی آنکھیں بھی نم ناک ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رونا رحمت ہے، آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غم زدہ ہے، لیکن ہم اپنی زبانوں سے وہی کہیں گے جس سے اللہ راضی ہو۔ اور ہم تیری جدائی پر غم زدہ ہیں اے ابراہیم۔ اس سے واضح ہوا

کہ ایسے موقعوں پر آنکھوں سے آنسو نکل آنا غلط نہیں ہے۔ پسندیدہ امر بہر حال یہی ہے کہ انسان تین دن بعد اپنی معمول کی زندگی پر لوٹ آئے۔

بیٹی کے گھر رہنا

سوال: ہمارے معاشرے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ بیٹوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والدین کی دیکھ بھال کریں۔ بوڑھے والدین سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے کسی بیٹے کے ساتھ ہی رہیں اور اگر کسی وجہ سے والدین اپنی بیٹی کے ساتھ رہنا شروع کر دیں تو یہ بیٹوں کی توہین سمجھی جاتی ہے۔ اس بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: بوڑھے والدین کی خدمت کے لیے ساری اولاد برابر کی ذمہ دار ہے خواہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ عام طور پر والدین بیٹے کے ساتھ رہنے میں زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں، کیونکہ بیٹے کا رشتہ داماد کی بہ نسبت بہر حال زیادہ قریبی ہوتا ہے۔ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، اس میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں والدین کا بیٹی کے گھر رہنا جو معیوب سمجھا جاتا ہے، اس کا تعلق معاشرے کے عرف سے ہے نہ کہ شریعت کے کسی حکم سے۔ ان تمام معاملات میں جن میں شریعت خاموش ہے انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حالات کے تناظر میں اپنے لیے خود زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

چور کے مقطوع ہاتھ کی پیوند کاری

سوال: موجودہ زمانے میں میڈیکل سائنس کی ترقی نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ کٹے ہوئے ہاتھ کی پیوند کاری کی جا سکے۔ اگر کسی چور پر قطع ید کی سزا نافذ کی جائے اور وہ سائنس کی اس ترقی سے فائدہ اٹھا کر ہاتھ دوبارہ لگوا لے تو پھر وہ کس طرح معاشرے اور دوسرے مجرموں کے لیے باعث عبرت بن سکتا ہے؟ کیا اس صورت میں اسلام کی تجویز کردہ یہ سزا غیر موثر نہ ہو جائے گی؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ قطع ید کی سزا کا مقصد عادی چوروں کو دوسروں کے لیے باعث عبرت بنانا ہے تا کہ معاشرے سے اس جرم کی بیخ کنی ہو سکے، مگر مجرم کو عبرت زدہ حالت میں قائم رکھنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ اسلامی

سلطنت کی حدود اور عدالتی دائرہ اختیار کے اندر ہو۔ایسی صورت میں عدالت کسی بھی مناسب حال پابندی کا نفاذ کر سکتی ہے۔ لیکن اگر مجرم اسلامی سلطنت کی حدود یا عدالت کے دائرۂ اختیار ہی سے باہر جا چکا ہو یعنی کسی دوسرے ملک میں تو پھر اسلامی سزاؤں کے نفاذ یا ان کے برقرار رہنے کی توقع رکھنا بے معنی ہو جاتا ہے۔

معذور بچے کا وراثت میں حصہ

سوال: کیا ایک ذہنی طور پر معذور بچہ بھی اپنے باپ کی وراثت میں اسی طرح اور اتنے ہی حصے کا حق دار ہے جس طرح کہ ایک نارمل بچہ؟

جواب: جی ہاں ایسا بچہ بھی اتنے ہی حصے کا حق دار ہے، تاہم یہ حصہ ایک سرپرست کی تولیت میں دیا جائے گا جو اسے اس معذور بچے کی دیکھ بھال پر خرچ کرے گا۔البتہ اگر سرپرست تنگ دست ہو تو ایسی صورت میں وہ بھی بقدر ضرورت معاشرے کے معروف طریقے پر اس میں سے لے سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صحیح مسلک کا تعین

سوال: مجھے یہ کس طرح اطمینان ہو سکتا ہے کہ میں اسی اسلام پر عمل پیرا ہوں جس پر چلنے کا مجھے خدا کی طرف سے حکم ہے؟ بہت سے مسالک کے متضاد نظریات بعض اوقات پریشان کر دیتے ہیں۔ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اس سلسلے میں ایک بنیادی مقدمے کا مستحضر رہنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ انسانی عقل کے کچھ حدود ہیں۔اسے غلطی بھی لگ سکتی ہے اور مختلف علما کی عقل ایک ہی مسئلے میں انھیں مختلف نتائج تک بھی پہنچا سکتی ہے۔ چنانچہ مختلف احکامات کی مختلف تعبیرات اور تشریحات اسی بنیادی مقدمے کا منطقی نتیجہ ہیں۔اس سلسلہ میں اصل اہمیت ان دلائل کی ہوتی ہے جو کسی نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔تلاش حق کے متلاشی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دلائل کو نہایت دیانت داری سے عقل و شعور کے ترازو میں تول کر دیکھے اور پھر یہ فیصلہ کرے کہ کون سی بات اسے زیادہ اپیل کرتی ہے اور پھر اسے چاہیے کہ وہی نقطۂ نظر اختیار کرے جس کے بارے میں اسے عقل و شعور کی روشنی میں اطمینان ہے۔

مزید براں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ختم نبوت کے بعد وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔اب کلام وحی کے

بعد انسان کی عقل ہی اس کی رہنما ہے۔ انسانی عقل کے بارے میں چونکہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے حق کی آخری شکل پا لی ہے، اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ انسان ہر وقت اپنے نظریات کے بارے میں تنقید کا دروازہ کھلا رکھے اور دوسروں کی آرا کا دیانت داری سے جائزہ لیتا رہے۔ مذہبی معاملات میں آرا کو اختیار کرنے میں اصل اہمیت اخلاص اور سنجیدگی کی ہے۔ اگر ایک شخص تلاش حق کے بارے میں دیانت دار اور مخلص ہے تو پھر یہ بات ثانوی ہے کہ وہ کس نتیجے تک پہنچا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر ایک شخص اپنے اجتہاد میں صحیح نتیجہ تک پہنچتا ہے تو اسے دہرا اجر ملے گا اور اگر غلط نتیجہ اخذ کرتا ہے تو پھر بھی اکہرا اجر پائے گا۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس راہ میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ ایک شخص نے تلاش حق کی کوشش وسعی کس قدر کی اور وہ اس میں کس حد تک مخلص ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عیدالاضحیٰ

شوال کے مہینے کی پہلی تاریخ کو عید الفطر اور ذی الحجہ کی ۱۰ تاریخ کو عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کی عید منائی جاتی ہے۔ یہ دونوں دن اسلام میں خوشی کے دن ہیں، جن میں دو دو رکعت نماز بطور شکر کے پڑھی جاتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں اہل مدینہ کے لیے دو دن خوشی کے مقرر تھے جن میں وہ لہوولعب میں مشغول ہوتے تھے اور خوشیاں منایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک دن ''نوروز'' کا تھا اور دوسرا دن ''مہرجان'' کا۔ نوروز کے دن آفتاب برج حمل میں جاتا ہے اور مہرجان کے دن برج میزان میں داخل ہوتا ہے۔ ان دونوں دنوں میں آب و ہوا چونکہ معتدل ہوتی ہے اور رات دن برابر ہوتے ہیں، اس لیے ان دنوں کو لوگوں نے خوشی منانے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ جب اہل مدینہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھیں ان دنوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان دنوں سے بہتر دن عنایت فرمائے ہیں، تم عیدین کے ان بابرکت دنوں میں خوشی منا سکتے ہو۔

عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کی عید کا فلسفہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کو حکم خداوندی سمجھتے ہوئے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے۔ سورۂ صافات میں ہے:

> ''پس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچا اس نے کہا، اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں تو غور کر لو تمھاری کیا رائے ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اے میرے باپ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی تعمیل کیجیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ پس جب دونوں نے اپنے تئیں اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا اور ہم نے اس کو آواز دی: اے ابراہیم، بس، تم نے خواب سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک یہ کھلا ہوا امتحان تھا اور ہم نے اس کی ملت پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ سلامتی ہو ابراہیم پر اسی طرح ہم خوب کاروں کو صلہ دیتے ہیں۔'' (۱۰۲۔۱۱۰)

حضرت ابراہیم کی اس امتحان میں کامیابی کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ اس کی تحسین اللہ تعالیٰ نے ''قد صدقت الرؤیا'' کے شان دار الفاظ سے کی۔ ہم مسلمان اپنے جد امجد کی اپنے رب کے حضور تسلیم و رضا کی علامتی پیروی میں ہر سال

اپنی استطاعت کے مطابق قربانی کرتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لازم ہے کہ اپنے رب کے آگے تسلیم و رضا کے تجدید عہد کے لیے ہم شعوری طور پر ایسا کریں۔

عیدالفطر کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم طاق عدد میں کھجوریں کھاتے تھے، البتہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے بعد کچھ تناول فرماتے، کیونکہ غربا و مساکین کو گوشت تو قربانی کے بعد ملتا ہے، اس لیے نبی کریم خود بھی کھانے پینے میں تاخیر کرتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے پس ماندہ طبقے کی عزت و احترام اور دل جوئی اسلام کی اولین ترجیح ہے۔

احادیث نبوی کی روشنی میں ہم نماز عید اور قربانی کے بارے میں ضروری باتیں یہاں درج کر رہے ہیں:

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب عید کے دن عید گاہ تشریف لے جاتے تو واپس دوسرے راستے سے آتے تھے۔'' (دارمی)

عید گاہ جاتے ہوئے راستے میں تکبیر یعنی 'اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر و للہ الحمد' پڑھتے رہنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عبداللہ سے روایت ہے:

''نہ عیدالفطر کی نماز کی اذان دی جاتی ہے اور نہ بقرعید کی نماز کی۔'' (مسلم)

عیدین کی نماز دو رکعت ہے جس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا پہلی رکعت میں تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لے اور ثنا پڑھ کر تین تکبیریں کہے، تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ کر سورۂ فاتحہ اور کوئی دوسری سورہ پڑھے۔ دوسری رکعت میں رکوع میں جانے سے پہلے تین تکبیریں کہے اور چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے اور دوسری رکعت مکمل کر لے۔ عیدین کی نماز میں خطبہ نماز کی ادائیگی کے بعد ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو جمعہ اور عیدین کی نماز میں شریک ہونے کی بہت تلقین کی ہے اور کسی عذر کے لاحق ہونے کی صورت میں فرمایا کہ کم از کم خطبہ ہی سن لیا کرو، اس طرح دین کے بارے میں آگہی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت جابر بیان کرتے ہیں:

''میں عید کے دن حضور اکرم کے ہمراہ نماز میں شریک ہوا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان و تکبیر کے بغیر خطبہ سے پہلے نماز شروع فرمائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو (خطبہ کے لیے) حضرت بلال کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان فرمائی۔ لوگوں کو نصیحت کی اور انھیں عذاب و ثواب (کے احکام) یاد دلائے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کی ترغیب دلائی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی جماعت کی طرف متوجہ ہوئے حضرت بلال بھی آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے عورتوں کو اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا، ان کو نصیحت کی اور انھیں عذاب و ثواب (کے احکام) یاد دلائے۔'' (نسائی)

قربانی چونکہ خدا کے سامنے تسلیم و رضا اور اس کی اطاعت کا علامتی اظہار ہے، اس لیے ان احساسات کو شعوری طور پر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الفاظ میں بھی ادا کرنا چاہیے۔قرآن مجید میں ہے:

''اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، بلکہ اس کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔'' (الحج ۲۲:۲۲۔۳۷)

حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذبح کے دن دو دنبے ذبح کرنا چاہے۔آپ نے ان کا رخ قبلہ کی طرف کیا اور یہ دعا پڑھی:

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض علی ملة ابراهيم حنيفاً وما انا من المشركين ان صلاتی ونسكی ومحيای ومماتی لله رب العالمين لا شريك له وبذلك امرت وانا من المسلمين اللهم منك ولك . (ابوداؤد)

''میں اپنا منہ اس ذات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس حال میں کہ میں دین ابراہیم پر ہوں جو توحید کو ماننے والے تھے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بلاشبہ میری نماز، میری تمام عبادتیں، میری زندگی، اور میری موت (سب کچھ) اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمان ہوں۔ اے اللہ یہ قربانی تیری عطا سے ہے اور خالص تیری ہی رضا کے لیے ہے۔''

اپنی استطاعت کے مطابق قربانی کے لیے بہترین جانور کا انتخاب کرنا چاہیے۔حضرت علی فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھ اور کان کو اچھی طرح دیکھ لیں (کہ ایسا کوئی عیب اور نقص نہ ہو جس کی وجہ سے قربانی درست نہ ہو)۔'' (ترمذی)

عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے جانور کو نماز کی ادائیگی کے بعد ہی ذبح کرنا چاہیے، نماز سے پہلے جانور کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔اس سلسلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت ہے:

''حضرت جندب ابن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں عید قربان کے موقع پر نبی کریم کے ساتھ (عید گاہ) حاضر ہوا، ابھی آپ نماز اور خطبہ سے پوری طرح فارغ نہیں ہوئے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ قربانی کا گوشت رکھا ہے اور نماز پڑھنے سے پہلے ہی قربانی ہوگئی ہے، آپ نے فرمایا کہ جس نے قبل اس کے کہ نماز پڑھے، (جانور) ذبح کر دیا، اسے چاہیے کہ وہ اس کے بدلے میں دوسرا جانور ذبح کرے۔'' (مسلم)

عیدالاضحیٰ کے موقع پر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قربانی کا گوشت غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے؟

قربانی کا گوشت معاشرے کے تمام غربا، مساکین، اور مستحق لوگوں کو دیا جا سکتا ہے، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم کیونکہ غیر مسلم بھی ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔قرآن مجید اور احادیث میں جہاں بھی صدقہ وخیرات کی ترغیب دی گئی ہے، وہاں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔سورۂ بقرہ میں ہے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''وہ اپنے مال ،اس کی محبت کے باوجود،قرابت مندوں،یتیموں،مسکینوں،مسافروں،سائلوں اور گردنیں چھڑانے یعنی (غلام آزاد) کرنے پر خرچ کرتے ہیں۔'' (۲: ۱۷۷)

جب ہم اس طرح کسی غیر مسلم کو اپنی خوشیوں میں شریک کریں گے تو ان کے دل میں قربانی کے فلسفے کو جاننے اور اسلام کے پیغام سمجھنے کی ترغیب پیدا ہوگی۔اور یہ چیز اسلام کی طرف دعوت دینے کا محرک بھی بن سکتی ہے۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اگر قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بجائے اتنے ہی پیسے کسی غریب کو دے دیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اس بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کے لیے پورا سال ہوتا ہے، جب بھی کوئی ضرورت مند ہمارے سامنے آئے، ہمیں اپنے حالات ووسائل کے مطابق اس کی مدد کرنی چاہیے۔اس کا اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے،قربانی تو درحقیقت حضرت ابراہیم کی سنت کی پیروی میں تجدید عہد ہے کہ ہم اپنے رب کی اطاعت اور تسلیم ورضا کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔

—— کوکب شہزاد

دانش سرا کا پیغام

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

میں نے زندگی میں، اپنے والد سمیت، بہت سے جنازوں کو کندھا دیا ہے، مگر کسی نے میری کمر اس طرح نہ توڑی جس طرح پچھلے دو جنازوں نے توڑ ڈالی۔ پہلا جنازہ چھ ماہ کی ایک معصوم بچی کا تھا۔ وہ زندہ میری گود میں آتی تو ایک پھول کی طرح بے وزن محسوس ہوتی۔ مگر جب میں مسجد سے باہر اس کا مردہ جسم اپنے ہاتھوں میں اٹھائے کھڑا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا ایک پہاڑ ہے جس کے تحمل کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی ہے۔ قبرستان کے سناٹے میں اس معصوم کے روتے ہوئے باپ کو دیکھ کر دل پھٹتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس نوجوان حافظِ قرآن کو کیسے تسلی دوں۔ اگر کوئی بیماری، کوئی ناگہانی آسمان سے آئی ہوتی تو صبر کی تاکید کرتا۔ اس بچی کو تو جاہل مسیحاؤں اور ان کی غفلت نے مارا تھا۔ صبح جس ہسپتال میں اسے حصول شفا کے لیے لے جایا گیا، وہاں کے قاتل مسیحاؤں نے ایک غلط انجکشن لگا کر اس معصوم کو اپنے ہاتھوں موت کے حوالے کر دیا تھا۔

ایسی ہی کچھ کیفیت میری اس وقت تھی جب چند دن بعد میں ایک اور قبرستان میں کھڑا تھا۔ میرے کندھے اس بیس سالہ نوجوان کے جنازے کو کندھا دینے کے بعد شل ہو چکے تھے، جسے اب قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ وہ صبح سویرے اپنی بہن کو اسکوٹر پر کالج چھوڑنے گیا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ واپسی کا سفر موت کا سفر ہوگا۔ جب خدا و قانون سے بے خوف اور سڑک کے قواعد

سے جاہل و بے پروا ایک ویگن ڈرائیور نے اسے کچل ڈالا۔ وہ ڈرائیور بھاگ نکلا۔ میں جھلستی ہوئی دھوپ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ ٹرانسپورٹ مافیا کے زر پرستوں نے اسے ڈرائیونگ کے صرف دو آداب سکھائے ہوں گے۔ حادثہ سے پہلے گاڑی بھگایا کرو اور حادثے کے بعد خود بھاگ جایا کرو۔ ایسے میں اس نوجوان کے بھائی کی آسمان تک بلند چیخیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میرا افسردہ وجود اور دکھی ہو گیا۔ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گیا اور میں اوپر آسمان کو دیکھنے لگا۔ زمین پر دیکھنے کے لیے رکھا ہی کیا ہے بجز غربت و جہالت اور ان کے المناک نتائج کے۔

میں سوچتا ہوں کہ خدا نے مجھے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت دی ہے۔ اس قوم میں نمایاں مقام حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ میں امریکا و روس اور یہود و ہنود کے ان مظالم کا پرچارک بن جاؤں جو وہ مسلمانوں پر ڈھا رہے ہیں۔ میرا قلم ان کے خلاف زہر اگلے اور میری زبان ان پر شعلے برسائے۔ میں کشمیر، فلسطین، افغانستان اور چیچنیا کے مسلمانوں کا مرثیہ لکھوں۔ مسلمانوں کا لہو گرماؤں، جذبۂ جہاد پیدا کروں اور شوقِ شہادت بیدار کروں۔ خطابت پسند اور جذبات گزیدہ اس قوم میں ایسی باتوں کی بڑی مانگ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس خدا نے قلم و بیان دیا ہے اسی نے مجھے فکر و نظر سے بھی نوازا ہے۔

یہ فکر و نظر بتاتا ہے کہ جتنے مظالم مسلمانوں پر غیر مسلم ڈھا رہے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ستم مسلمانوں پر ان کے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں ہو رہے ہیں۔ یہ قوم جتنی اپنے ہم قوموں کے ہاتھوں ستائی جا رہی ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی غیروں نے نہیں کیا۔ جان، مال، عزت و آبرو جس طرح اپنے برباد کر رہے ہیں، اس کا کوئی حصہ بھی غیروں نے پامال نہیں کیا۔ کہیں ہوس زر میں اور کہیں ہوس اقتدار میں، کہیں جہالت سے مغلوب ہو کر اور کہیں غربت سے تنگ آ کر، کہیں اخلاق سے محرومی کی بنا پر اور کہیں دین سے ناواقفیت کے سبب، کہیں جان بوجھ کر اور کہیں انجانے میں۔

جان کا قصہ تو سن لیا۔ کرپشن زدہ معاشرے کے باسیوں کو مال کا قصہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ اب ان دونوں سے زیادہ قیمتی شے کی داستان سن لیں ـــــ آبرو ـــــ جس کی خاطر جان مال سب لٹا دیا جاتا ہے۔ عورتوں کے خلاف تشدد کے خاتمہ کے دن پر جاری ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق مملکت خداداد پاکستان میں ہر دو گھنٹے بعد ایک بیٹی بے آبرو کر دی جاتی ہے۔ یاد رہے یہ اس معاشرے کا بیان ہے جہاں جان و مال لٹ جانے کا سانحہ تو رپورٹ ہو جاتا ہے، مگر آبرو لٹنے کا معاملہ پولیس کچہری تو کجا ہم دردوں تک بھی لے جانے کا رواج نہیں۔ حقیقت کا بیان تو اس قدر بھیانک ہو گا کہ سوچ کر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ تاہم زیادہ بڑا سانحہ یہ ہے کہ اس گھناؤنے فعل کے ارتکاب کے لیے ہندو، یہودی، روسی یا امریکی باہر سے نہیں درآمد کیے جاتے۔ قوم کی یہ خدمت اپنے ہم قوم و ہم مذہب خود سر انجام دے رہے ہیں۔

اس قوم میں بڑے لیڈر اور دانش ور ہیں جو اخباری کاغذ کے مینار پر چڑھے قوم کو اذن جہاد دے رہے ہیں۔ وہ قوم کے جذبات کو دوسری اقوام کے خلاف مشتعل کر کے خود مقبولیت حاصل کرتے اور انتہائی قیمتی نوجوانوں کو ''ایمل کاسی'' بنا دیتے ہیں۔ پھر یہ نوجوان تمام مسلمہ اخلاقی اور دینی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور آخر کار

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ان لوگوں کو اپنی دکان چمکانے کے لیے ایک اور شہید ہاتھ آ جاتا ہے۔

یہ لوگ نہیں بدلیں گے۔ ہم انھیں ان کے حال پر چھوڑتے ہیں۔ ہم اپنے جہاد کا رخ اس دشمن کی طرف کرتے ہیں جو ہمارے اندر سے ہمیں زیادہ بڑا نقصان پہنچا رہا ہے۔ یہ دشمن جہالت ہے، غربت ہے، اخلاقی اقدار سے غفلت ہے، صحیح دینی علم سے بے رغبتی ہے۔ ہر وہ شخص جسے خدا نے شعور کا ایک ذرہ بھی عطا کیا ہے، اس پر فرض ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دے۔ اس طرح کہ وہ اپنے گھر، اپنے محلے، اپنے حلقے، اپنے دفتر اور ہر اس جگہ جہاں اس کی بات سنی جا سکتی ہے، وہ یہ پیغام پہنچائے کہ ہمارا دشمن ہمارے اپنے اندر ہے۔ ہمیں ہر سطح پر اس دشمن کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ جب ہم یہ کر لیں گے تو ہمارے بیرونی دشمن بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اور اس کے بغیر ہمارے دشمنوں کو ہمارا کچھ بگاڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنی صورت آپ بگاڑنے کے لیے بہت ہیں۔

یہ شعور و آگہی کا پیغام ہے۔ یہ عقل و دانش کا پیغام ہے۔ یہ ''دانش سرا'' کا پیغام ہے۔

ـــــ ریحان احمد یوسفی

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کثرت اختلاف و اظہار اختلاف

جب میری شادی ہوئی تو مجھے اپنے سسرال والوں کے کچھ رواج اور ان کی کچھ عادتیں بہت پسند آئیں، البتہ کچھ طور طریقے میری مرضی کے مطابق نہ تھے۔ میں ان کے مقابلے میں اپنے گھر کی ریت کو بہتر سمجھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنے گھر والوں کے اچھے معمولات اور اپنے سسرال والوں کی پسندیدہ روشوں کا اختلاط کر کے بہتر طور طریقوں کو رواج دوں گا، لیکن ہائے افسوس کہ واقعات میری خواہشوں کے برعکس ہونے لگے۔ ہمارے گھر کے برے اطوار اور سسرال والوں کی بری رسومات میں میل ہوا اور ان کے اتحاد نے وہ کُھل کھیلا، وہ طوفان مچایا کہ اللہ پناہ! یوں امیدوں کا خاتمہ ہوا اور حسرتوں کا جنازہ نکلا۔

بالکل ایسے ہی دنیا میں ہر سو نا خوبیوں کے اتفاق اور نیکیوں کے بٹوارے کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ شیطان شیطان سے معانقہ کرتا ہے اور اہرمن اہرمن کو آواز دیتا ہے۔ بندگان خدا منتشر ہیں، ہر کوئی اپنی محدود دنیا میں مگن ہے۔ زاہد پری رخوں کے جھرمٹ سے گھبرا کر اپنے کنج میں جا بیٹھا اور یاد خدا میں مصروف ہو گیا، عالم نے عبا پہنا اور اپنی سحر بیانی سے لوگوں کا دل موہنے لگا، قاضی نے کتابوں کا پلندا اٹھایا، دفتر سجایا اور ظاہری الفاظ کو فیصلوں کا روپ دینے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ سب الگ الگ گروہ بن گئے اور ان کی نمایاں خوبیاں ان کی چھاپ بن گئیں۔ یہ اپنے اپنے شعبے کو پورا دین سمجھنے لگے اور دوسرے شعبے کے

افراد کو کج روشمار کرنے لگے۔ صدیاں بیتیں اور جتنے شعبے تھے اتنے فرقے وجود میں آ گئے۔ یہ باہم برسر پیکار ہوئے اور کبھی تکفیر کا بازار گرم ہوا۔

اصلاحی تحریکوں نے اس انتشار کو مزید نمایاں کیا۔ ایک تحریک کی بنیاد توحید باری تعالیٰ کے پرچار پر تھی۔ اس نے بجا طور پر شرک کا رد کیا، لیکن اس کی تطہیری مہم کئی مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی گئی یہاں تک کہ بڑے بڑے علما کی تحریروں میں سے مشرکانہ رنگ نکال کر دکھا دیا گیا۔ یہ اکابر گزر چکے تھے، ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ خود ان کو اپنی صفائی کا موقع دیتے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ کار پردازان اصلاح اور ان بزرگوں کے پیروکاروں میں ٹھن گئی، فتووں اور الزامات کی ایسی گرد اٹھی کہ اصلاح عقائد کا مقصد غبار آلود ہو گیا۔ دوسری تحریک نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا فروغ دینا اپنا نیک مقصد بنایا، لیکن نجانے کیوں غیر مصدقہ واقعات اور چند نیک افراد کے خواب سنا کر یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ پھر یہ عاشقان رسول، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دوئی مٹانے کے درپے ہو گئے۔ ایسا ہو نہ سکتا تھا، لہٰذا موحدین اور عاشقین میں معرکہ آرائی ہوئی، کئی مناظرے ہوئے اور جنگ وجدال تک نوبت پہنچی۔ ہر فریق نے اپنے موقف کو زبردست دلائل سے مضبوط کیا اور مدمقابل کو مشرک و کافر یا گستاخ رسول ثابت کر دیا۔ یوں رخ اللہ اور نبی کا مقام متعین کرنے کی طرف پھر گیا اور محبت رسول کا مقصد فروگزاشت ہو گیا۔ ان کے بعد وحدت امت کا پرچار کرنے والے آئے۔ ان کا طریقہ تھا، اپنے موقف کو چھوڑو نہ دوسرے کو برا بھلا کہو۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک طرح کی جنگ بندی کہا جا سکتا ہے، اختلاف کی خلیج پھر بھی نہ پاٹی جا سکی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کیا ایسا نہ ہونا ممکن تھا؟ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اختلافات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے زمانے ہی میں پیدا ہو چکے تھے۔ ان اختلافات کی وجہ سے صفین اور جمل نامی جنگیں بھی ہوئیں۔ بعد کے زمانوں میں اقتدار کے خانوادوں میں کشمکش اقتدار رہی، فقہی مسالک کے حاملین میں دلائل والزامات کا تبادلہ ہوا اور اہل سجادہ بھی ثمرات اختلاف سمیٹنے میں مصروف رہے۔ اور آج کا دور تو تفرق وانتشار میں بازی لے گیا ہے۔ ایک فرقے سے کئی فرقے پیدا ہوئے، ہر جماعت کئی گروپوں میں بٹی اور ہر تحریک نے کئی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔

دیکھنا چاہیے، اختلاف پیدا کیسے ہوتا ہے؟ انسانی نفس دوسروں کی برائیوں کی کھوج میں رہتا ہے۔ اس کا یہ شغف اچھائیوں کے ملنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ آس پاس کے لوگ بھی برائیوں کی طرف توجہ دلانے میں لگے رہتے ہیں، اس طرح نیکیوں کا ملنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر ہر آدمی کی پسند مختلف ہوتی ہے، یہ اختلاف مزاج بھی اشیا کی اہمیت و نا اہمیت میں فرق ڈال دیتا ہے۔ کبھی انسان غلط فہمی سے کسی مسئلے کو وہ اہمیت دے دیتا ہے جو اس کی ہوتی نہیں، یوں افراط وتفریط کے شاہکار وجود میں آتے ہیں۔ اور آج کے دور کے پیشواؤں نے اپنے پیروؤں کو یک رخا کر کے اختلاف کی دراڑیں بہت گہری کر دی ہیں۔ ''اختلاف امت باعث رحمت ہے'' کسی کا مقولہ ہے جسے عام طور پر حدیث نبوی سمجھا جاتا ہے۔ البتہ یہ قول بھی ایک معنی رکھتا

ہے، اختلافِ آرا اسے سوچ کے دائرے وسعت اختیار کرتے ہیں اور کسی مسئلے کی گوناگوں صورتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ یہ اختلاف روا رکھا جا سکتا ہے اور مسائل کی تنقیح وتخریج کے لیے اسے فروغ دیا جا سکتا ہے۔

انبیا علیہم السلام نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو یہ ان کا اپنی قوم سے اظہار اختلاف ہی تھا۔ ان کے طریقۂ اختلاف کا مطالعہ کرنے اور اپنی زندگی میں اس پر عمل کرنے سے اختلاف کی مضرتوں سے بچا جا سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو بڑے پیار سے 'یٰٓاَبَتِ' (اے ابا جان) کہہ کر پکارا اور پھر فرمایا کہ: ''آپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے۔ وہ تو خدائے رحمان کا پکا نافرمان ہے۔'' ان کے باپ نے دھمکی دی: ''ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تمھیں سنگ سار کر چھوڑوں گا۔'' آپ سلام کر کے رخصت ہو گئے، ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرنے کا وعدہ کیا۔ جب آپ نے حسب وعدہ دعاے استغفار کی تو اللہ کی جانب سے انھیں روک دیا گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دیتے ہوئے فرمایا: ''مجھے تمھارے اوپر ایک کڑے دن عذاب آنے کا خطرہ ہے۔ آپ کی قوم کے لیڈروں نے جواب دیا، ہمارا خیال ہے کہ آپ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔'' حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت جاری رکھی اور 'وَاَنْصَحُ لَکُمْ' (میں تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں) کے الفاظ فرما کر اپنی بے غرضی ظاہر کی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہی معاملہ حضرت ہود علیہ السلام کا ہوا۔ جب آپ کی قوم نے کہا: ''ہمارا خیال ہے کہ آپ حماقت میں مبتلا ہیں اور ہم آپ کو جھوٹے لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔'' حضرت ہود علیہ السلام نے اپنے رسول ہونے کا بیان کیا اور فرمایا: 'وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ' (میں تمھارا خیر خواہ ہوں اور تمھیں امانت داری سے نصیحت کر رہا ہوں)۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر زلزلے کا عذاب آیا اور آپ کی دعوت کا اختتام یوں ہوا: 'وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ' (اے میری قوم! میں نے تو تمھاری خیر خواہی کی تھی، لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہ کرتے تھے)۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے حکم ہوا: ''کہہ دو، میں اس (فریضۂ انذار و بشارت ادا کرنے) پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا، پس محبت قرابت کا حق ہے جو ادا کر رہا ہوں۔''

تمام انبیا علیہم السلام کو دعوت کا آغاز اپنے خاندان اور قبیلے سے کرنے کا حکم ہوا۔ اسی اصول پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا: ''اپنے قریبی خاندان والوں کو خبردار کرو' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھ کر پکارنے لگے: ''اے بنو فہر! اے بنو عدی میں تمھیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے آیا ہوں۔'' آپ نے اپنے جد عبد مناف کی اولاد، اپنے چچیرے عباس بن عبد المطلب، اپنی پھوپھی صفیہ اور اپنی بیٹی فاطمہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اپنا آپ بچا لو، میں اللہ کے ہاں تمھارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔''

ان نفوس قدسیہ نے خدائی رہنمائی کے تحت سچی خیر خواہی کے ساتھ اختلاف کیا، لیکن ان کے مخاطبین نے اسے ذاتی مخاصمت پر محمول کیا۔ انھوں نے اللہ کے رسولوں کے مدمقابل کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح وہ اختلاف پیدا ہوا جو حل نہ ہو سکا اور اس نے ٹکراؤ (Clash) کی صورت اختیار کی۔ بالآخر اللہ کے فیصلے کے مطابق رسول کامیاب ہوئے اور ان کے منکرین اپنے انجام کو پہنچے۔

انبیا علیہم السلام کی دعوت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کرنے والے کو اپنے موقف کا صحیح پتا اور اس پر پختہ یقین ہونا چاہیے۔ اسے حقائق کا صحیح علم حاصل ہونا چاہیے تاکہ اس کا علمی مغالطوں میں الجھنے کا امکان کم ہو۔ اسے اپنے مخاطب سے رنجش نہ ہو، بلکہ وہ اس کا سچا خیر خواہ ہو۔ وہ طرح طرح کے دل نشیں طریقوں سے اپنے اختلاف کو پیش کرے اور اپنے مخاطب کے دل میں گھر کرنے کی کوشش کرے۔ اختلاف برائے اختلاف کبھی اچھا اثر نہیں چھوڑتا اور ہمیشہ جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے، ہمیشہ نزاعی نکتے سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ کوشش کرنی چاہیے، ایک متفقہ اصل سے بات شروع ہو اور پھر مختلف فیہ فرع تک آیا جائے۔ اختلاف کرنے والے کے سامنے ایک واضح مقصد ہو، تبھی اس کا اختلاف کارگر ہو گا۔ وہ دوسروں کی برائیوں کو نہ کریدے۔ خود بھی دوسروں کی اچھائیوں پر دھیان دے اور دوسروں کی توجہ بھی انھی کی طرف دلائے۔ وہ اختلاف مزاج کو حق کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دے۔ یہ چند نکات ہیں جنھیں ملحوظ رکھ کر اختلاف کو نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے۔

ـــــ محمد وسیم اختر مفتی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایمل کاسی کے قاتل

۱۴ نومبر ۲۰۰۲ کو سی آئی اے کے دو اہل کاروں کے قتل کے جرم کی پاداش میں ایمل کاسی کو امریکا کی ریاست ورجینیا کی جیل میں موت کی سزا دے دی گئی۔

کوئٹہ کا ایمل کاسی سیدھا سادھا نوجوان اور سادہ دل مسلمان تھا۔ وہ کوئی بنیاد پرست نہ تھا۔ اس نے نہ کسی دینی مدرسے میں تعلیم پائی، نہ وہ کسی جہادی تنظیم میں شامل ہوا اور نہ اسے جیتے جی کبھی کسی جنگی تربیتی کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کے باوجود اس نے دو بے گناہ آدمیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ اس حادثے کے بعد سے لے کر موت کی دہلیز تک اس نے نہ کبھی اپنے جرم کے اعتراف میں بخل سے کام لیا اور نہ اس پر ندامت کا اظہار کیا۔ ایمل نے اس دوہرے قتل کی وجہ ان الفاظ

میں بیان کی:

''مجھے ہلاک ہونے والوں کے لواحقین کے دکھ کا اندازہ ہے۔ مجھے انھیں مار کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میرا نشانہ کوئی فرد نہیں، امریکی حکومت تھی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے سی آئی اے کے ملازم خود امریکا میں بھی نشانہ بن سکتے ہیں۔ میرا ردعمل مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسیوں کے خلاف تھا۔''

اس کے بیان سے بالبداہت واضح ہے کہ امریکا کی پالیسیوں کے خلاف ردعمل کے نتیجے میں اس نے یہ قتل کیے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی شخص کے مباح الدم ہونے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مسلمان نہ ہو۔ یہ چیز قرآن مجید کی صریح نصوص اور دین کی واضح تعلیمات کے خلاف ہے۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس نے کسی کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا گویا سب کو بچایا۔

نہ جانے کتنے ایمل کاسی ہر روز دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں اسی طرح موت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ اور ہم مارنے والوں کو ظالم اور اپنے ایمل کاسیوں کو شہید قرار دے کر نئی ماؤں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں جو اغیار کے مقتل میں تازہ خون سے قوس قزح کے رنگ بھرنے کے لیے اپنے جگر گوشوں کو دشمنوں کی قربان گاہ میں بھیجنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور وہ اگر اس کے لیے رضامند نہ بھی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہم دنیا میں جان رائیگاں کی ادنیٰ سی قربانی کے عوض آخرت میں جنت کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ نوجوان اپنی بوڑھی ماؤں کو بے سہارا، اپنی ناتواں بہنوں کو بے بس اور اپنے معصوم بیوی بچوں کو بے یارو مددگار چھوڑ کر ہماری بنائی ہوئی خیالی جنت کو خدا کی جنت سمجھ کر دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ خدا کے بندوں کے جتنے حقوق ہم نے پامال کیے ہیں، خدا اس عظیم قربانی کے عوض انھیں نہ صرف معاف کر دے گا، بلکہ شاباش دے گا کہ تمھارا یہ اقدام اگرچہ دین کے احکام اور شریعت کے تقاضوں کے خلاف تھا، مگر تم نے چونکہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس لیے تمھاری ساری بے ضابطگیاں اور بے اصولیاں معاف کی جاتی ہیں اور اب تمھارا ٹھکانا جنت ہے۔

پانچ سال تک امریکی جیلوں کی سختیاں جھیلنے کے بعد ایمل کاسی کو زہر کے تین ٹیکوں کے ذریعے سے موت کی وادی میں دھکیل دیا گیا۔ اسے موت کی سزا بظاہر امریکا نے دی، مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کی موت کے پروانے پر دستخط کرنے والے اصلاً ہم مسلمان ہیں۔ ہم نے دین کا جو تصور اپنی نوجوان نسل کو دیا، اس کے مطابق ایمل کاسی کو وہی کرنا چاہیے تھا جو اس نے کیا۔ اور اس کا جو انجام ہوا، ہم نے اسی کے لیے اسے تیار کیا تھا۔ ہم نے اسے یہی بتایا تھا کہ کافر کو اس کی معصومیت اور بے گناہی کے باوجود قتل کرنا نہ صرف جائز، بلکہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ ایمل جب ہمارے تصور دین کے مطابق دو کافروں کو جہنم واصل کرنے کے بعد کامیابی سے دیار غیر سے فرار ہو کر اپنے وطن پاکستان پہنچ گیا تو ہم نے اسے بیس لاکھ ڈالروں کے عوض ڈیرہ غازی خان کے ایک ہوٹل سے گرفتار کرایا اور مقتول کے ورثا کے حوالے کر

دیا۔اور جب قاتل کے لیے اولیاے مقتول کا فیصلہ امریکا کی حکومت نے نافذ کر دیا تو ہم نے ظالم امریکا کے جرائم کی فہرست میں ایک اور جرم کا اندراج کر کے اپنے شہید کوخراج تحسین پیش کیا اوراس کی لاش کوامریکا کی ناپاک زمین سے لاکراپنے وطن کی پاک سرزمین کی لحد میں اتار دیا۔

___ محمداسلم نجمی

بسنت

ہرسال موسم بہارشروع ہوتے ہی بسنت کاتہوار منایا جاتا ہے۔اس کے پس منظر میں یہ سوچ ہوتی ہے کہ سردی کے موسم سے ٹھٹھرتی ہوئی زندگی کوقرار مل گیا ہے۔ بےلباس درختوں نے سبز ےاوررنگوں کا پہناوااوڑھ لیا ہے۔سرسوں کے پیلے پھول اپنی خوش نمائی کے جلوے دکھا رہے ہیں،لیکن ہمارے ہاں اس تہوار کومنانے کی روایت منفرد ہے۔مہینوں پہلے اس کی تیاری کے لیے تیز ڈوروں اور پتنگوں کی تیاری شروع ہوجاتی ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل سیاحوں اور دوردراز سے آئے ہوئے مہمانوں سے بھر جاتے ہیں۔ان کی چھتیں پتنگ بازوں کی اڑان،موسیقی،نعرے بازی اورفائرنگ کے لیے سجائی جاتی ہیں۔قطع نظراس کے کہ یہ تہوار ہندووانہ ہے یاموسمی؛ ہم یہ سوچنے پرمجبور ہیں کہ کیاکسی بھی قوم کے لیے اس طریقے سے کوئی تہوار منانا باوقاراور شایستہ بات ہے؟ کیا کوئی باذوق اورمہذب انسان اس طرح کی نعرہ بازی اورفائرنگ کواپنی خوشی کے اظہار کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔

اسلام نے ہرخوشی اورتہوار کے موقع پرغریبوں اورضرورت مندوں کوشریک کرنے کی تلقین کی ہے،لیکن اس تہوار میں شریک ہونے کے لیے غربا کبھی چھتوں سے گرتے ہیں اورکبھی پتنگ لوٹنے کے لیے گاڑیوں کے نیچے کچلے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ موٹرسائیکل اورسائیکل پرسفرکرنے والوں اور پیدل چلنے والوں کی گردنیں تیز ڈور سے زخمی ہوجاتی ہیں۔

اس تہوار کومنانے کے لیے ایک بڑا منطقی استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے ہزاروں لوگوں کومعاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ بے روزگاروں کوروزگار ملتا ہے،لیکن اس پرغور کیوں نہیں کیا جاتا کہ اس دن کتنی ماؤں کی گود ویران ہوتی ہےاور کتنی عورتوں کا سہاگ اجڑ تا ہے؟

عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اورشراب کا بہت رواج تھا،جب شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اورملک میں قحط کی حالت پیدا ہوتی تو عرب کے سخی اورفیاض لوگ مختلف جگہوں پراپنے حلقے بناتے،خوب شراب پیتے اورپھرشراب کی مدہوشی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں جس کسی کے اونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کرتے، پھر اس کے مالک کو منہ مانگے دام دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ ہر شخص جتنا گوشت جیتتا، وہ اسے غریبوں اور ضرورت مندوں میں بانٹ دیتا۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جوئے اور شراب کا یہ پہلو تھا جس کی وجہ سے عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کا شمار فیاضی اور سخاوت کے خصائص اور خدمت خلق اور ہمدردیِ غربا کے محرکات میں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ جب قرآن نے انفاق اور ہمدردیِ غربا پر بہت زور دیا تو بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اسلام غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی اور ان کی امداد کے لیے مال خرچ کرنے پر اتنا زور دیتا ہے تو آخر جوئے اور شراب میں کیا خرابی ہے جو قحط کے زمانے میں غربا کی امداد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قرآن نے ان کے سوال کا جواب دیا:

''وہ شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں، لیکن ان کا نقصان ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔'' (البقرہ ۲:۲۱۹)

یعنی اس میں شبہ نہیں کہ ان چیزوں سے سوسائٹی کو بعض اعتبارات سے کچھ فائدے تو ضرور پہنچ جاتے ہیں، لیکن ان سے فرد اور سماج، دونوں کو جو مادی اور اخلاقی نقصانات پہنچتے ہیں، وہ ان کے فوائد کی نسبت سے بہت زیادہ ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے انھیں حرام قرار دیا۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۰۵)

کیا ہم عالم کے پروردگار کی اس ابدی ہدایت کی روشنی میں بسنت جیسے تہوار کا جائزہ لینے کے لیے تیار ہیں جس کے نقصانات اس کے فائدے سے بڑھ کر ہیں۔

——— کوکب شہزاد

یاددہانی

ہم لوگ اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ دلوں کے سکون کے لیے قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ نماز و روزہ کے پابند ہیں، لیکن اگر اپنے اندر جھانک کر دیکھیں تو ہمارا روحانی وجود اتنا مطمئن اور پرسکون نہیں جتنا کہ ایک بندۂ مومن کا ہونا چاہیے۔ یہ بے چینی اور اضطراب کیا ہے۔ ہر وقت کچھ کھو جانے کا اندیشہ کیوں ہے۔ رمضان کے مہینے میں جب انسان کو اپنا تزکیہ کرنے اور اپنے رب سے قریب ہونے کے بہت سے مواقع ملتے ہیں تو مجھے بھی اس نفسیاتی الجھن پر غور کرنے کا موقع ملا اور میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ہم کہتے تو ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں، لیکن ہم عبودیت کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حق ادا نہیں کرتے، ہم نعمت ملنے پر شکر کے الفاظ تو ادا کرتے ہیں، لیکن اس نعمت پر اپنا ہی استحقاق سمجھتے ہیں اور دل میں اس نعمت کو اپنی صلاحیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ہم کہتے تو ہیں کہ یہ دنیا آزمایش کی جگہ ہے، لیکن کبھی زندگی کو آزمایش نہیں سمجھتے۔ دنیوی کامیابیوں کے حصول میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ آخرت ایک تصوراتی چیز بن کر رہ جاتی ہے، دنیوی فائدے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوتے ہیں، لیکن آخرت کی کامیابی کے لیے تھوڑا سا بھی نقصان برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ دنیوی حرص و ہوس اپنی ذات کی حد تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اتنا مال ہو کہ ہمارے بعد ہماری اولاد اور پھر کئی نسل تک جمع کر لیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس دنیوی زندگی میں صرف اللہ کے بندے بن کر رہیں۔ اس کی پسند کے رنگ میں رنگے جائیں اپنی ذات پر اپنے رب کے کنٹرول کو اتنا مضبوط کر لیں کہ وہ جہاں روکے وہاں رک جائیں اور جہاں چلائے وہاں چل پڑیں اور ’راضیة مرضیة‘ کے اس مقام کو پالیں جہاں کچھ اور پانے کی تمنا نہ رہے، اپنے بچوں کے لیے دنیوی کامیابیوں کی دعا ضرور کریں، لیکن اصل پیش نظر ان کی آخرت کی کامیابی ہو ’فلیتنافس المتنافسون‘ کا میدان یہ دنیا نہیں، بلکہ آخرت ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’تم میں سے بہتر وہ ہے جس نے اپنا مال صدقہ و خیرات کر کے آگے بھیج دیا، جو وارثوں کے لیے چھوڑا اس میں اس کا کچھ نہیں۔‘‘

کوشش کریں کہ آخرت میں وہ موقع نہ آئے جب یہ کہا جائے گا:

’’مجرم تمنا کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کی پناہ رہا ہے اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچا لے۔‘‘ (المعارج ۷۰: ۱۱۔۱۴)

—— کوکب شہزاد

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

—— جاوید

O

علم آزردہ ہے اپنی حسرتِ تعمیر میں
شام آ پہنچی افق پر اِس جہانِ پیر میں

میں نے چاہا تھا کہ دیکھوں خواب کچھ تیرے لیے
اور تو ظالم، اُلجھ کر رہ گیا تعبیر میں

یہ نہیں کہ بے سبب ہے شعلہ افشانی مری
ہے ابھی شاید کوئی حلقہ تری زنجیر میں

کھینچ کر اُس کو نہ رسوا ہوں کبھی مردانِ حق
دم اگر باقی نہ ہو کچھ سینۂ شمشیر میں

یہ جہاں وہ ہے کہ اِس میں اُن کو دیکھا چاہیے
صفحۂ عالم پہ اُن کی شوخیِ تحریر میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org